مجلس ادارت

جلد ۱۴۳ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۹ء عدد ۲

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

جینوا معاہدہ کے تحت افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا وقت آگیا ہے، اور ان سطروں کی اشاعت تک وہ اپنے ملک کو واپس جا چکی ہوں گی، سوویٹ یونین نے ۱۵ فروری سے پہلے ہی افغانستان سے فوجوں کو بلا لینے کا اعلان کیا ہے، وزیر خارجہ مسٹر شیوارناڈزے نے تمام فوجوں کی عدم واپسی کے متعلق افغانستان کے صدر نجیب اللہ کے مطالبہ کو مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے ملک نے افغانستان سے مکمل انخلا کا فیصلہ کر لیا ہے، تاکہ مزید خوں ریزی نہ ہو، خبروں کے مطابق افغان مجاہدین نے کابل کا محاصرہ کر لیا ہے، امریکہ اور دوسرے ملکوں نے اپنے سفارت خانے بند کر کے شہریوں کا تخلیہ شروع کر دیا ہے، یہ بھی پتہ چلا ہے کہ صدر نجیب اللہ بھی کابل چھوڑ کر روسی سرحد کے قریب کسی شہر میں مقیم ہو گئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حکومت کا وقت آخر آپہونچا ہے۔

نو برس تک مجاہدین کے سروں سے موج خون گذرتی رہی مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، ان کی طویل جد وجہد، مسلسل قربانی، بے مثال شجاعت، عزم راسخ اور حیرت انگیز صبر و استقلال نے ظلم و ستم کی چٹانیں چور چور کر دیں، اور انھوں نے روس جیسی بڑی حکومت کو بھی سرنگوں ہو جانے کے لیے مجبور کر دیا، ان کی فتح و کامرانی اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام کی مرضی کے خلاف زور اور زبردستی سے کوئی حکومت ان پر مسلط نہیں کی جا سکتی، جبر و استبداد، فوجی مداخلت، توپ و تفنگ، ٹینک اور اسلحے آزادی کی طلبگار زندہ قوموں کی راہ میں بہت دنوں تک حائل نہیں ہوتے، افغانستان سے روس کی بے دخلی میں بڑی طاقتوں اور استعمار پسندوں کے لیے یہ سبق پنہاں ہے کہ وہ چھوٹے، کمزور اور پسماندہ ملکوں کو محکوم بنائے رکھنے کا خطرناک کھیل نہ کھیلیں۔

کہا جاتا ہے کہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان میں قتل عام شروع ہو جائے گا، اور خود مجاہدین کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی، ایران اور پاکستان میں مقیم باغی افغانوں کے گروہی اختلافات کا

حوالہ بھی دیا جاتا ہے، ان سطروں کی تحریر کے وقت ان کے مختلف گروہوں میں سمجھوتے کی اطلاع آگئی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کی تشکیل مجلس شوریٰ کا دو روزہ جلسہ ۱۰ فروری کو راولپنڈی میں ہوگا، لیکن بیرونی طاقتیں جامع سیاسی حل کے لیے مذاکرات پر زور دے رہی ہیں، وہ ۷۳ء میں معزول کیے جانے والے ظاہر شاہ کو اٹلی سے افغانستان واپس لانے کی فکر میں بھی ہیں، روس مجاہدین کی مجوزہ مجلس شوریٰ میں صدر نجیب اللہ کی پارٹی کو نمایندگی دلانے اور نئے انتظام میں نجیب حکومت کو شامل کیے جانے کے لیے سرگرم جد وجہد جاری رکھے ہوئے ہے، جس کے لیے مجاہدین کا کوئی گروہ بھی آمادہ نہیں ہے، ان کے لیے یہ بڑا نازک اور اہم وقت ہے، اگر انھوں نے ہوش و تدبر سے کام لے کر اپنے اختلاف کو اتحاد سے بدل دیا تو وہ دن دور نہیں کہ جب افغانستان پر ان کی حکومت قائم ہو جائے،

اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نارائن دت تیواری نے اپنے ایک بیان میں اردو کی ترقی کے بعض اقدامات کا ذکر کیا، اور اردو کے ہر معاملہ اور ریاست میں اس سے متعلق پالیسی کے نفاذ پر عمل درآمد کی دیکھ بھال کے لیے محکمہ تعلیمات میں ایک اڈیشنل ڈائرکٹر کی تقرری کا اعلان کیا، جس کے دائرہ کار میں اردو نصاب کی کتابوں اور اردو پرچوں کا انتخاب بھی ہوگا، چند ماہ قبل اتر پردیش اردو اکاڈمی کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ نے اردو کے متعلق اسی طرح کے کاموں کیلیے ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل کا اعلان بھی کیا تھا، اور نومبر ۸۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے وفد کو انسانی وسائل کے مرکزی وزیر مسٹر شیو شنکر نے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ "مرکز صوبائی حکومت پر زور ڈالے گا کہ وہ اردو تعلیم کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کرے"

جوں جوں الکشن کا زمانہ قریب آتا جائے گا اسی طرح کی خوش آیند باتیں اردو والوں کے کانوں میں گونجتی رہیں گی، مگر اب اردو والے اس طرح کی مراعات نہیں چاہتے جس کا نہ کبھی کوئی نتیجہ

نکلا ہے اور نہ نکلے گا، وہ اردو کا جائز قانونی و دستوری حق مانگتے ہیں، اپنے بیان میں وزیر اعلیٰ نے ریاست میں "سہ لسانی فارمولا" کو سختی سے لاگو کیے جانے کا ذکر بھی کیا، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ سہ لسانی فارمولا میں اردو کو شامل کیے جانے اور گجرال کمیٹی کی سفارشات کو قبول کرنے میں کیا مانع ہے؟ سابق مرکزی وزیر کرن سنگھ کا خیال ہے کہ ہندی والے علاقوں میں جنوبی ہند کی زبانوں کے بجائے اردو اور سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں شامل کیا جانا چاہیے، ایک موقع پر جب وزیر اعلیٰ سے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا تو وہ حالات کا عذر کر کے اسے ٹال گئے، آخر حالات کی تبدیلی کے انتظار میں ہمارے وزیر اعلیٰ کب تک سیکولرازم، جمہوریت اور انصاف کے تقاضوں اور اردو کے جائز اور معقول حق کو نظر انداز کرتے رہیں گے

آج کل جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وہ کلیدی خطبہ اردو والوں کے غم و غصہ اور تشویش و اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ کی تیسری اردو ریسرچ کانگریس میں دیا گیا، اور جس میں اردو کے تحفظ کے لیے اس کے ایک سے زائد رسم الخط کی ضرورت بتائی گئی، در اصل یہ تجویز اردو کی موت کا پیش خیمہ ہے، صدیوں کے چلن سے زبان اور رسم خط میں جسم و جان کا سا رشتہ استوار ہو جاتا ہے، کسی زبان سے اس کے رسم خط کا رشتہ توڑ دینے کے بعد اس کا ادب تب و تاب اور تازگی و توانائی سے محروم ہو جاتا ہے اور خود وہ زبان بھی باقی نہیں رہتی، پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا فرمایا ہے کہ "شاندار ماضی رکھنے والی کسی بھی زبان کے رسم خط کو بدلنے سے صفحۂ قرطاس پر نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں گی جو نئے خیالات اور نئی آوازوں کی حامل ہوں گی قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو جائے گی، قدیم ادب اور قدیم زبان دونوں کی موت واقع ہو جائے گی، ہندوستان میں ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، اس قسم کی تبدیلی ظالمانہ غارت گری ہوگی جس سے عام تعلیم کی ترقی کو سخت دھکا لگے گا"!

جموں یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ایمرٹس شپ میں تاحیات توسیع کر دی ہے، اور مزید سہولتیں بھی دی ہیں تاکہ وہ مرتے دم تک علمی ادبی اور تحقیقی کاموں کو انجام دیتے رہیں، اسکے لیے ہم نعیین خلوص مبارکباد دیتے ہیں اور یونیورسٹی ایگزیکٹو کونسل خصوصاً وزیر اعلیٰ کشمیر کی جوہر شناسی کی داد دیتے ہیں۔

مقالات

نظریاتی سطح پر عصر جدید کا چیلنج اور مذہب

از
جناب حافظ سید ولی حسین جعفری، ہمدرد نگر۔ نئی دہلی

(۵)

تصوف | یورپ میں فرانسیسی انقلاب اور ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجہ میں جب پرانی اقدار بالکل سے فراموش کر دی گئیں، اور سیاسی اور سماجی نظام ابتر ہو گیا اور فاتح قوموں نے اپنے علوم و فنون اور فکر و فلسفہ کو مفتوح قوموں پر مسلط کیا تو عام مسلمان تو در کنار بادشاہ، علماء اور صوفیہ بھی گوناگوں اخلاقی عیوب اور دینی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تدوین کرا کر جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا[1]۔

یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد جس طرح کے نظریات و افکار کا ارتقاء ہوا۔ اس کا ذکر ہو چکا لیکن ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس لیے کہ وہی لوگ یہاں حاکم بن کر آئے تھے، برصغیر کے معاشرہ میں سب سے زیادہ فلسفہ و تصوف کا اثر و نفوذ ہوا، اس لیے کہ یورپ کی طرح یک بارگی مذہب کا لبادہ یہاں اتارنا مشکل تھا،

---

[1] تاریخ مشائخ چشت حصہ پنجم ص ۶۱

کیونکہ یہاں مسلم معاشرہ کو کبھی مذہب کے نام پر ان سخت حالات سے دوچار نہیں ہونا پڑا، جن سے عیسائی معاشرہ دوچار ہوا، اسلام کے اثر و نفوذ کے باوجود برصغیر کی غیر مسلم آبادی کو بھی مذہب کے نام پر کبھی کلیسا جیسی چھوٹ نہیں رہی۔

صوفیائے خام نے تصوف کے سرچشمہ کو قرآن وحدیث سے ہٹا کر ویدانت اور اپنشد کی طرف منتقل کر دیا، عملیات اور تعویذ گنڈوں میں بھی حد سے زیادہ اعتقاد بڑھ گیا، اس کی وجہ سے ملت کے قوائے عمل شل ہو گئے،[۱] رہے علماء تو وہ عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے، ان کا سارا وقت دور از کار بحثوں میں صرف ہوتا تھا، اور قرآن وحدیث سے ان کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا،[۲] جبکہ متقدمین صوفیہ کا سارا دار و مدار کتاب و سنت پر تھا، حافظ ابن جوزی نے گمراہ صوفیوں پر شدید رد و کد کی ہے، مگر وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ قدمائے صوفیہ قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر کے امام تھے،[۳] حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآن اور حدیث کے علم کو اہلِ طریقت کے لیے لازمی قرار دیا ہے،[۴] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے علماء اور صوفیہ کی بے راہ روی کو دور کرنے کے لیے یہ راہنما اصول وضع کیا تھا۔

دراصل قوموں کے زوال و انحطاط اور حکومتوں کے عدمِ استحکام کے زمانے میں عموماً لوگ ظاہر سے بے پرواہ ہو کر باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، بدھ مت اور ہندو مت میں بھی فلسفہ ویدانت کی تعلیم اور جوگیوں اور سنیاسیوں کی زندگی کے نمونے ملتے ہیں،[۵] بھگتی تحریک کو بھی اسی پسِ منظر میں دیکھنا چاہیے، اسلام سے قبل عیسائیوں میں اس قسم کے خیالات یعنی باطن کی مشغولی کے رجحانات موجود تھے، جس میں غلو بہت زیادہ تھا، اور جس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ان لوگوں کی روش ناپسندیدہ تھی۔[۶]

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت حصہ پنجم ص ۶۶ [۲] ایضاً ص ۶۵ [۳] تلبیس ابلیس ص ۳۴۵ [۴] القول الجمیل ص ۱۴ [۵] امام غزالیؒ کا فلسفۂ مذہب ص ۲۰۵ [۶] سورۂ حدید آیت ۲۷۔

یورپ سے مذہب کی بالادستی ختم ہونے کے بعد جب غیر مذہبی افکار و نظریات کا بول بالا ہوا تو لوگ مذہب سے پیچھا چھڑانے کے درپے ہوئے، اس کی وجہ یہی تھی کہ افراط و تفریط سے پورا معاشرہ تنگ تھا، مگر برصغیر میں انحطاط و تنزل کے باوجود اسلام کے علمبرداروں نے اسلامی معاشرہ کو خدا بیزار ہونے سے بچایا۔

یہاں کے مصلحین امت نے سب سے زیادہ توجہ اس امر کی طرف دی کہ کہیں اسلامی روح، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایۂ زندگی تباہ نہ ہو جائے، اور اس کی نزاکت و اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنی کوششوں کا رخ اسلامی معاشرہ کی اصلاح کی طرف موڑ دیا، اس کی وجہ سے حکومت کے چلے جانے کے بعد بھی اسلامی سرمایۂ زندگی ان کے لیے سرچشمۂ قوت بنا رہا، یہی امت مسلمہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان ہے کہ چاہے اس کا سب کچھ چھن جائے لیکن اگر دین باقی ہے تو وہ خود بھی باقی رہے گی، فقہ اسلامی کی تدوین نے مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی کو سنوارنے میں عظیم الشان کام کیا، لیکن جب اس کو حیلے اور حیل سازی کا ذریعہ بنایا گیا تو مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل بے روح ہو کر رہ گئی، متکلمین نے اسلام کو یونانی فلسفہ کی زد سے بچا کر اس کی بڑی خدمت انجام دی، لیکن جب علم کلام نے شکوک و شبہات ہی پیدا کرنا اپنا مقصد بنا لیا تو مسلمانوں کی ذہنی زندگی میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا، یہی حال تصوف کا بھی ہوا، جب باطنی زندگی کو ظاہری زندگی سے الگ کیا گیا تو شریعت و طریقت کی تفریق پیدا ہو گئی، دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دے دی گئی، مجاز پرستی، بت پرستی، قبر پرستی اور نغمہ و سرود کو روحانی ترقی کا لازمی جزء قرار دے دیا گیا، بے شک یہ سب گمراہیاں تصوف میں پیدا ہوئیں، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ صوفیہ صافی نے ہمیشہ ان گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی۔[۱]

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت طبع اول ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۔

اصل میں تصوف کی توجیہ و تشریح ہر زمانہ میں کچھ اس طریقہ سے ہوتی رہی کہ اس کو ایک طبقہ نے بالکل سے بازیچۂ اطفال بنالیا، اور دوسرے طبقہ نے اس کو اس حد تک گرایا کہ اس کی اصطلاح سے رشتہ توڑنا شروع کر دیا، یہ صرف افراط و تفریط کا نتیجہ تھا، اور عمل اور رد عمل کا یہی انجام ہوتا ہے۔

کسی بھی فکر اور فلسفہ کا مطالعہ کرتے وقت اگر معاشرہ اور حکومت کو بھی سامنے رکھا جائے، تو اس خاص فکر کے پسِ منظر کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے، اور تصوف کا مطالعہ کرتے وقت ان دو عناصر کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں ان کا طریقہ قرآن و سنت کے زیادہ مطابق نہ تھا، اس دور میں جہاں اور بہت سی بدعات کا رواج ہوا ان میں سب سے بڑی کمزوری یہ آئی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی مسلمانوں کی دینی زندگی کی اصلاح و تربیت جو اب تک خلفاء کے اہم ترین فرائض میں شامل تھی نظر انداز کر دی گئی۔

اسلام اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے مسلمانوں کی تمام زندگی پر یقیناً محیط ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف امور مملکت ہی کو دیکھا جائے، اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی دینی حمیت مانع نہ ہوتی، ان سے برسر جنگ ہونا اس بات کی طرف صریح اشارہ ہے کہ اسلام دین و دنیا دونوں کا نام ہے۔

مگر خلفائے راشدین کے بعد دین اور دنیا کی الگ الگ تشریح نے ہی معاملہ کو خراب کیا، معاشرہ کی اصلاح اور دینی زندگی کی تعلیم و تربیت سے سراسر کوتاہی نے بگاڑ کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ بلاشبہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، لیکن کارِ نبوت کی ہر وقت ضرورت ہے اسلام کا مقصد حکومت قائم کرنے کے بجائے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" کے مشن کی تکمیل تھا، جن مفکرین کی نظر نبضِ ملت پر تھی، انھوں نے اپنے دور کی بے دین اور بے راہ رو حکومتوں سے ٹکرانے کی پالیسی نہیں اپنائی، بلکہ انھوں نے خاموشی سے اصلاح امت کا کام کیا، ان حضرات نے معاشرہ کی اصلاح بالکل اس طبیب کی طرح کی جو مرض کی اچھی طرح تشخیص کرنے اور مریض کے حالات کی مکمل رعایت کے بعد دوائیں تجویز کرتا ہے۔

ہر تحریک نئے ملک اور نئے ماحول میں پہونچ کر اس جگہ کے ہم آہنگ عناصر کو ساتھ لینے کی کوشش کرتی ہے، تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو، اور نشو و نما کا صحیح موقع ملے، بشرطیکہ وہ ہم آہنگ عناصر اس کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہوں، مگر یہ بڑا نازک موڑ ہوتا ہے بقول پروفیسر نظامی :

"یہ وہ دوراہہ ہے جہاں اسلام کی ترقی اور زوال کے راستے مل جاتے ہیں، ذرا سی لغزش سے صدہا گمراہیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذرا سی حکمت سے ہزاروں کو ضلالت و گمراہی سے نکل جانے کا موقع مل جائے"[۱]

پروفیسر حبیب نے "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" کے تعارف میں صوفیانہ تاریخ کے فلسفہ کا عمدہ تجزیہ کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ گو اموی خلافت کے طریقوں سے صحابۂ کرامؓ نے اتفاق نہیں کیا، لیکن مجبوراً انھیں تسلیم ضرور کیا، بایں ہمہ اس زمانے میں بھی لوگوں کی دو جماعتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی روحانی اور شخصی آزادی کا تصور پیش کیا جو آگے چل کر اسلام کا جز بن گیا، پہلی جماعت اُن صحابۂ کرام کی تھی جنھوں نے حکومت کی بدلی ہوئی ہیئت اور بدلی ہوئی نیت کو دیکھتے ہوئے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۴

کو نظر انداز کر کے خاموش زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، اور دوسری جماعت نے مذہبی رہنماؤں اور سلاطین وقت سے کنارہ کشی ہو کر حضرت حسن بصریؒ کے گرد جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا، ان دونوں جماعتوں کے اثر سے یہ اصول ترتیب پا گیا کہ مذہبی رہنما اگر حکومت وقت سے متعلق ہو تو اسے واجب الاحترام نہ خیال کیا جائے[1]۔

اس کے فوراً بعد جب خلافت کا مرکز بغداد ہوا جہاں ایرانی عنصر غالب تھا تو وہاں سے تصوف پیدا ہوا، فقہ حنفی بھی عراق ہی سے وجود میں آئی، اور چونکہ ہندوستان میں اسلام ایران کے راستہ سے آیا، لہٰذا یہاں فقہ حنفی بھی آئی، اور تصوف بھی آیا، یہی وجہ ہے کہ اسلامی ہند کا کوئی محقق نہ فقہ حنفی سے قطع نظر کر سکتا ہے اور نہ تصوف سے بے نیاز ہو سکتا ہے[2]۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا یہ تجزیہ راقم کے خیال میں مناسب اور درست معلوم ہوتا ہے، مگر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اس پر گرفت کی ہے کہ "اسلامی صوفیہ کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ مصری اشراقیوں، عیسائیوں، یونانیوں، اور آخر میں ہندوستان کے جوگیوں سے مختلف چیزیں لے کر انھوں نے تصوف کی عمارت کھڑی کی ہے"۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مختلف زاویوں سے اسلام کے حقیقی تصوف اور اجنبی اجزاء کو جدا کر کے دکھایا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے ان چیزوں کے بارے میں بھی مستقل کتابیں تالیف کیں جن کا تصوف سے محض برائے نام تعلق تھا، مثلاً جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈہ وغیرہ[3]۔ ایک جگہ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں کہ

---

[1] اسلامی دنیا کے مذہبی رجحانات ص ۱۰۸۔ [2] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر طبع دوم ص ۲۳۲ [3] ایضاً ص ۲۱۷۔

اس زمانے میں لوگ شرقاً و غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں، یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات لوگوں کے لیے کتاب و سنت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں، بلکہ عامۃ الناس تو صوفیہ کے رموز و اشارات کے بغیر کوئی چیز قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے، چنانچہ اگر کوئی ان رموز و اشارات کو ماننے سے انکار کرے یا ان سے بے توجہی برتے تو اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے، اور نہ اسے نیکوکاروں میں سمجھتے ہیں[1]۔

دراصل افراط و تفریط نے ہمیشہ معاملات کو غلط رخ پر ڈال دیا اور کسی سنجیدہ اور غیر جانبدار مطالعہ سے روک دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح چیزوں کی توجیہات و تشریحات بھی اپنے اپنے میلان اور رجحان کے مطابق کی گئیں۔

جن لوگوں کو نہ قرآن و حدیث کا علم تھا اور نہ ان میں تدبر و تفکر کرنے کی صلاحیت تھی ان کی وجہ سے تمام خرابیاں رونما ہوئیں، یہاں تک کہ تصوف کا سرچشمہ غیر اسلامی عناصر میں تلاش کیا جانے لگا۔

اصل میں تصوف نام ہے قرب الٰہی اور روحانی مشاہدے کا[2]۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسے منتخب اور برگزیدہ لوگ موجود تھے، جن کی زندگیاں از سر تا پا اللہ کے لیے وقف تھیں، اور ان کا جذبۂ عبادت بھی عام انسانی قوت کے معیار سے بہت زیادہ تھا، اس زمانے کے بنیادی روحانی رجحانات کا پتہ ان آیات قرآنی سے چلتا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ... اِلى اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا[3]۔

---

[1] ارمغان شاہ ولی اللہ ص ۱۹۶ [2] امام غزالی: المنقذ من الضلال ص ۶۰ تا ۶۹ [3] سورہ فرقان آیت ۶۳ تا ۷۵۔

خلفائے اربعہ کے زمانے تک تصوف یعنی تقرب الٰہی کی شدید خواہش اتنی عادی چیز تھی کہ مجموعی طور پر پوری امت کے اندر نفوذ کر گئی تھی، اور اس کا اثر غیر شعوری طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ بعد کے لوگوں نے خود بخود صحابہ کے حلقوں میں اپنے آپ کو منسلک کر رکھا تھا، اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے حلقوں سے لوگ وابستہ ہونا کامیابی سمجھتے تھے، اصل میں صوفیہ اور تصوف کی اصطلاح بعد کی ہے، پہلے تقویٰ اور خشیت الٰہی کی اصطلاح سے لوگ آشنا تھے۔

قرآن میں بار بار جو تقویٰ کی زندگی اور خشیت کا راستہ اختیار کرنے پر زور اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ یہ ایک اختیاری چیز ہے، اور اختیاری چیز کو اپنے اوپر مسلط کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے، یہی کام تصوف کا بھی ہے، اگر اس میں بھی اعتدال و توازن کو نہیں برقرار رکھا گیا تو یہ چیز مضر ہو سکتی ہے، احسان اور تزکیہ کے الفاظ تصوف سے زیادہ قریب تر ہیں، احسان کا مفہوم حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو یہ سمجھو کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔ اسی طرح لفظ تزکیہ کے معنی صفائی، ستھرائی کے آتے ہیں، تزکیہ مال کا بھی ہوتا ہے، اور روح کا بھی، اس اصطلاحی معنی میں یہ دونوں چیزیں ہم کو نیکی اور پاکبازی سے قریب کرتی اور انفاق پر آمادہ کرتی ہیں، تقویٰ اور نیکی کا مفہوم ان کے مخالف الفاظ سے بھی بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے، قرآن مجید میں ہے

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى — ایک دوسرے کی اعانت کرو، نیکی
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ — اور اللہ سے ڈرنے کے معاملے میں،
وَالْعُدْوَانِ [1] — اور نافرمانی اور گناہ کے بابت مدد نہ کرو

[1] سورہ مائدہ : آیت ۲۱

سورہ لیل کی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق اور تقویٰ لازم و ملزوم ہیں، نیز بخل اور تقویٰ اختیار نہ کرنا تمام برائیوں کی جڑ ہے، تقویٰ کی وضاحت حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ خاردار جھاڑی میں سے اپنے کپڑے اور دامن کو بچا کر اس طرح گذرنا کہ نہ کوئی کانٹا کپڑوں میں چبھے اور نہ دامن میں، گویا دنیا میں پھنس کر آدمی نہ اپنے آپ سے غافل رہے اور نہ اللہ سے، بالفاظ دیگر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی مکمل ادائیگی کا نام تقویٰ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ بزرگ ترین تم میں سے وہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو[1]، لیکن جب علماء و صوفیہ نے قرآن و حدیث میں تدبر و تفکر ترک کر کے اپنے نفس اور اپنے دور کے حالات سے مفاہمت کر لی، اور وہ دوسرے افکار و نظریات کے سامنے جھک گئے تو شریعت طریقت سے جدا معلوم ہونے لگی، حالانکہ اس سے قبل اس طرح کی تفریق کا کوئی وجود نہ تھا، اس لیے تقویٰ، احسان، تزکیہ، حقوق اللہ اور حقوق العباد اور امر بالمعروف، و نہی عن المنکر وغیرہ سب چیزیں صحیح معنوں میں انسان کو اللہ سے قریب کرنے کا ایک ذریعہ تھیں۔

تصوف کی مشہور و متداول کتابیں مثلاً کتاب اللمع، التعرف، رسالہ قشیریہ عوارف، فتوح الغیب، احیاء العلوم، مدارج السالکین کے صرف ابواب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں توحید اور اس کے احوال، اتباعِ سنت، عبادات کی خشوع و خضوع کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیہ اخلاق کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کچھ کتابوں میں ایسے مضامین بھی ہیں جن سے بعض طبائع کو وحشت ہو سکتی ہے، لیکن درحقیقت ان کا تصوف کے اصول و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی کی فہم ان کو نہیں قبول کرتی ہے تو ان کو چھوڑ دے

[1] سورۂ حجرات : آیت ۱۳۔

اسی طرح اگر خلاف شرع کوئی بات نظر آئے تو ان کی وہی حیثیت سمجھنی چاہیے جو کتب تفسیر میں اسرائیلیات یا کتب احادیث میں موضوعات کی ہے، ظاہر ہے ان کی وجہ سے کتب تفسیر و احادیث سے تو قطع نظر نہیں کی جا سکتی ہے[1]، اس بارے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حاجی امداد اللہؒ کے زاویہ نگاہ پر بھی نظر ڈال لینا مناسب ہوگا: "وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلید سنت سے الگ ہو کر اختیار کیے جائیں معتبر نہیں، اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں، اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کرتی ہیں۔" (جلد اول، مکتوب دو صد و بست)

بعض جہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور طریقت الگ الگ چیزیں ہیں یہ محض ان کی کم فہمی ہے، طریقت بے شریعت خدا کے یہاں مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہے، قلب کا حال مثل آئینے کے ہے، آئینہ زنگ آلود ہے تو پیشاب سے بھی دھو جاتا ہے، اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے، لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے، ولی اللہ کو پہچاننے کے لیے اتباع سنت کسوٹی ہے جو تبع سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے، اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے، خرق عادات تو دجال سے بھی ہوں گی۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کی غرض اور نیت یہ تھی کہ ان کی کرامات کا بچشم خود مشاہدہ کرے، وہ دس سال خانقاہ میں رہا، مگر کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی، آخر مایوس ہو کر رخصت ہونے لگا تو شیخ نے وجہ پوچھی تو صاف صاف کہہ دیا، فرمایا: تو نے اس دس سال میں مجھ سے کوئی فعل خلاف سنت دیکھا؟ "نہیں"۔ ارشاد ہوا: "تم جاؤ" یہی جنید کی کرامت ہے۔ اسی ضمن میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے اس قول کو

---

[1] الفرقان ص ۱۸ تا ۱۹، ماہ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ۔

ملاحظہ کیجیے کہ اگر کوئی شخص ہوا میں اڑے مگر اس کا طریق اسوۂ محمدیؐ کے خلاف ہو تو وہ مردود ہے۔

دراصل متقدمین صوفیہ کا دور تابعین اور تبع تابعین کا دور تھا، ان کے سامنے علوم شرعیہ یعنی قرآن، حدیث، فقہ اور تفسیر کے سوا کچھ نہ تھا، صوفیہ بھی اسی مذہبی گروہ میں داخل تھے اس لیے وہ علوم شرعیہ میں بڑا تبحر رکھتے تھے، اور عام لوگوں کو بھی انھیں حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے، حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ علم تصوف کتاب و سنت کا پابند ہے، اس لیے جس نے قرآن نہیں پڑھا اور حدیث نہیں لکھی اس کے لیے اس علم میں گفتگو کرنا مناسب نہیں[1]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے، مگر اصل تصوف اپنی پاکیزہ ترین صورت میں احکام الٰہی کی پیروی، شریعت کی پابندی اور سنت کے اتباع کا نام ہے[2]۔ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ تصوف کی ابتدا بہ آغاز اسلام ہی سے ہو چکی تھی، کیونکہ ترک دنیا میں بعض صحابہؓ کے اندر ایسی شدت پائی جاتی تھی جس کی سرحد رہبانیت سے مل گئی تھی[3]۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین سے ان کے غلو و افراط کی اصلاح ہو جاتی تھی، چنانچہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی راہبانہ روش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرفت فرمائی تھی، اس کے علاوہ ابوداؤد میں کتاب الصوم میں بھی ایک صحابی کا ذکر ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سے زیادہ روزے رکھنے کی اجازت طلب کی مگر حضورؐ نے انھیں اسی قدر اجازت دی جس سے رہبانیت کا دروازہ بند رہے، صحابۂ کرام میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال بھی ملتی ہے، ان کے علاوہ دور نبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا اور اسلام کے دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک مستقل جماعت "اصحاب صفہ"

---

[1] معارف نمبر ۱ ج ۳۷ ص ۲۵ [2] ایضاً نمبر ۶ ج ۱۸ ص ۴۴۸ [3] ایضاً نمبر ۴ ج ۳۵ ص ۲۵۹۔

کی تھی۔

بعد کے لوگوں نے کتاب و سنت کو نظر انداز کر کے محض ان ہی بزرگوں کی ذات کو اپنے لیے نمونہ بنایا، رفتہ رفتہ حالات بدلے اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی گئی، اور اس کو قابو میں رکھنا مشکل ہوگیا، لوگوں نے اسلامی اقدار کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور ہوا و ہوس کو ہر معاملہ میں ترجیح دی جانے لگی تو اس موقع پر مشہور حدیث سے لوگوں نے استدلال شروع کیا: "اگر تمھارے زمانے میں اس قسم کے فتنے پیدا ہوں تو اُحد پر جا کر اپنی تلوار توڑ ڈالو، پھر اپنے گھر بیٹھو۔"[1]

تابعین اور تبع تابعین کے بعد زاہد و عابد کے لقب سے بزرگان دین کو پکارا گیا، مگر صوفی اور تصوف کے نام سے لوگ نا آشنا رہے، امام قشیری کی یہی رائے ہے[2]، صوفی کا لقب سب سے پہلے ابو ہاشم کو ملا جنھوں نے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی، لیکن طریقت کی ابتدا ان سے پہلے حضرت حسن بصریؒ سے ہو چکی تھی، جن کی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی[3] اور تصوف کی عام اشاعت حضرت جنید بغدادیؒ المتوفی سنہ ۲۹۷ھ نے کی[4]۔

شروع میں تصوف تحری علم الشریعۃ کا ہم معنی تھا، اس کے بعد وہ کتاب و سنت اور زہد و عبادت سے گزر کر مختلف علوم و فنون کا مجموعہ ہوگیا، اس کی صراحت تذکرۃ الاولیا ج ۲ ص ۲۰۰ میں اس طرح کی گئی ہے کہ "بعد ازاں طریقت بفلسفہ کشید"۔ یہ اشارہ شیخ بو علی سینا المتوفی سنہ ۴۲۸ھ کی طرف ہے کہ انھوں نے تصوف کو فلسفہ کے ساتھ ملا دیا[5]۔ اسی کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے، نیز جب ایک تہذیب اور ایک قوم دوسری قوموں اور تہذیبوں سے ملیں تو تصوف کے بارے میں نیا انداز فکر پیدا ہوگیا، اور جو تصوف

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۲۶ [2] رسالہ قشیریہ ص ۹ [3] معارف ج ۳۵ نمبر ۴ ص ۲۶۶۔
[4] ایضاً ص ۲۶۸ [5] ایضاً ۲۷۱۔

تحری علم الشریعۃ کا نام تھا وہ فلسفہ کے ذریعہ سمجھا جانے لگا۔

بعد میں یہ معاملہ اتنا آگے بڑھا کہ لوگ شریعت کی پابندی ہی کو بیکار سمجھنے لگے[1] اور پھر نئے نئے فرقے ظہور میں آئے جن میں ایک فرقہ حلولیہ بھی تھا، اس کا بانی ابو حمزہ حلولی تھا، اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے، اور بکثرت تصوف کے دائرہ میں آئے، وجد، استغراق، حسن پرستی کا ذوق اسی فرقہ کی بدولت تصوف میں پیدا ہوا[2]۔ اسی فرقہ کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ اپنے لیے چند اجسام کو منتخب کر لیتا ہے، اور ان میں اوصاف ربانی کے ساتھ حلول کر جاتا ہے، اور ان سے انسانی اوصاف کو زائل کر دیتا ہے۔

یہ واقعہ تو مراکش کی سرزمین طرطوش کا ہے، ابن بطوطہ نے ہندوستان کے جوگیوں کی ریاضتوں اور کرامتوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ میں نے ایک مسلمان کو دیکھا کہ وہ جوگیوں سے تعلیم حاصل کر کے اور پچیس ۲۵ دن تک کچھ کھاتا پیتا نہیں، اسی سلسلہ میں ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ بہت سے مسلمان جوگیوں کی پیروی کرتے ہیں تاکہ ان سے تعلیم حاصل کریں[3]۔ ان چیزوں کو دیکھ کر علماء نے تصوف کو غیر مذاہب کے اثرات کا نتیجہ بتایا ہے۔

تصوف کے مختلف سلاسل | اگرچہ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تصوف کے مختلف سلسلے پیدا ہوئے، جن کے اعمال و اشغال باہم مختلف تھے، اس کی توجیہ تفہیمات الٰہیہ میں شاہ ولی اللہؒ نے بہت اچھی کی ہے، جو مشائخ ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں کے باشندوں میں قوت بہیمیہ کا غلبہ تھا، وہاں قوت بہیمیہ کے توڑنے کی طرف زیادہ توجہ کی گئی، اور جو مشائخ معتدل ملکوں میں رہتے تھے انھوں نے ایسے اعمال و اشغال متعین کیے جن پر اعتدال کے ساتھ ہمیشہ عمل کیا جا سکے، اور جن مشائخ کے حلقے میں ایسے لوگ آئے جن کی

---

[1] تلبیس ابلیس ص ۳۹۵ [2] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد سوم ص ۱۰۵ [3] ابن بطوطہ جلد دوم ص ۱۲۲-۱۲۳۔

قوت بہیمیہ ضعیف تھی انھوں نے صرف اوراد و وظائف پر قناعت کی، لیکن جن مشائخ کے حلقے میں ایسے لوگ آئے جن کی قوت بہیمیہ سخت تھی، انھوں نے اس قوت کو توڑنے کے لیے اعمال و اشغال بھی سخت قرار دیے[1]۔

بہرحال ملک و قوم کے مختلف حالات کے لحاظ سے یہ طریقے اور سلسلے بھی لازمی طور پر مختلف ہوگئے، اور اسی کے ساتھ ساتھ جب تصوف کے علمبردار اہل شریعت نہ رہے تو ان میں مزید بدعات کا اضافہ ہوتا گیا۔

ہندوستان، ماوراء النہر اور مکہ و مدینہ میں طریقۂ نقشبندیہ کا رواج ہوا، طریقۂ قادریہ کو ہندوستان و عرب میں مقبولیت حاصل ہوئی، طریقۂ چشتیہ ہندوستان میں بہت زیادہ مقبول ہوا، توران اور کشمیر میں طریقۂ کبرویہ کو فروغ ہوا، مغرب، مصر، سوڈان اور مدینہ میں طریقۂ شاذلیہ کا رواج ہوا، طریقۂ شاذلیہ نے ہندوستان میں بھی حسن قبول حاصل کیا، سلسلۂ جلالیہ روم میں، احمدیہ عراق میں، اور حیدریہ خراسان میں پھیلا[2]۔

تصوف کے اس جائزہ کے بعد ہم اس کی تجدید و اصلاح پر گفتگو کرتے ہیں، کسی بھی معاملہ میں اگر دو متضاد خیال پائے جائیں تو اس پر بہت ہی محتاط انداز میں سوچنا چاہیے، تصوف کے بارے میں بھی دونوں ہی طرح کے لوگ ملتے ہیں، ایک تو وہ ہیں جو سرے سے اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اسے بدعت قرار دیتے ہیں، حافظ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ اور علامہ ابن جوزیؒ نے تصوف پر جو کچھ لکھا اس کو تنقید اور تردید تو کہہ سکتے ہیں، تجدید و اصلاح نہیں کہہ سکتے[3]۔ دوسری قسم کے لوگ تصوف کے منکر نہیں ہیں، بلکہ اسے مانتے ہیں لیکن وہ اس پر شریعت کو مقدم سمجھتے ہیں، اس لیے تصوف میں جو چیزیں شریعت کے خلاف شامل ہوگئی تھیں، ان سے انھوں نے تصوف کو الگ کرکے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۴۷ ۔ [2] ابن بطوطہ ج ۱ ص ۲۲۱ [3] معارف نمبر ۳ ج ۴۱ ص ۱۸۵ ۔

اس کی تجدید و اصلاح کا کام کیا، اور تصوف کی جو بگڑی ہوئی صورت تھی اس کو از سر نو درست کیا، نیز شریعت و طریقت کی توجیہ و تشریح کرکے انھیں لازم و ملزوم قرار دیا، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور دوسرے صوفیائے کرام نے خود مقام تصوف پر بیٹھ کر زمانے کے حالات اور ہندو مسلم تہذیب کے باہم میل جول کو مدنظر رکھ کر اسلام کی خدمت کی۔

ان بزرگوں کے بعد جب پھر تصوف کے نام پر معاشرہ جمود و تعطل کا شکار ہوا، بدعات کو فروغ ہوا، اور دین کی توضیح و تشریح میں انتہا پسندی کو اپنایا گیا اور سیاسی و ثقافتی اعتبار سے مسلم معاشرہ ایک بحران میں مبتلا ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی صورت و شکل میں ایک ایسا رہبر نمودار ہوا جس نے وقت، حالات اور قومی مزاج کو سامنے رکھ کر دین و دنیا کی تعبیر و تشریح کی، اس کی وجہ سے پھر پوری قوم کو سنبھلنے کا موقع ملا، ان کی بتائی ہوئی راہ پر آج تک لوگ گامزن ہیں، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تصوف کی تعبیر و تشریح جب کتاب و سنت سے الگ ہٹ کر کی گئی تو پورے معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہوئیں، اور جب اس کی تطہیر کا عمل دہرایا گیا، تو اس سے معاشرہ میں ایک نئی زندگی آئی۔

ظاہر بات ہے کہ جب تصوف کو فلسفہ سے ملا کر سمجھا جائے گا تو اس میں غیر مذہبی عناصر اور اسلام کے علاوہ دوسری تہذیبوں اور مذہبوں کی آمیزش بھی شامل ہوگی اور اصل معاملہ گڈمڈ ہوکر گمراہی کا سبب بنے گا، اس لیے ہم کو اس کے مطالعہ میں حق پسندی سے کام لینا چاہیے عربی میں ظلم کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا، اس بنا پر مطالعہ کا یہ انداز بھی ایک ظلم ہے، جو مذہب کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے، اس سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔

اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں

ڈاکٹر عبدالرب عرفان، صدر شعبۂ اردو و فارسی، انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور

فن تاریخ گوئی کا رواج مشرق کی صرف انہی زبانوں میں پایا جاتا ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ گو اس کی بنیاد عربی کے حروف ابجد کی عددی قدروں پر استوار ہے لیکن یہ اپنی پیدائش، نشو و نما اور ارتقا کے بلند ترین مدارج طے کرنے کے لیے فارسی اور صرف فارسی زبان کی مرہون منت ہے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس کائنات میں رونما ہونے والے واقعات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کے لیے اس کے دامن میں گنجائش نہ ہو۔ ولادت، شادی، وفات، عمارات کی تعمیر، کتابوں کی تصنیف، تالیف اور طباعت، بادشاہوں کی تخت نشینی، فتوحات، کسی کی کسی منصب پر ماموریت، خطاب یابی غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں رونما ہونے والے ہر طرح کے واقعات کے سنین پوری صحت کے ساتھ اس فن کے ذریعے محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ماہر تاریخ گو کا کمال یہ ہے کہ وہ چند لفظوں میں، صراحۃً یا کنایۃً متعلقہ واقعہ بھی بیان کر دے اور ان لفظوں سے اعداد جمل کے حساب سے مطلوبہ سال بھی برآمد کر دے۔ اس لحاظ سے تاریخ گوئی تمام اصناف ادب میں مشکل ترین اور دماغ سوز فن ہے، اس کے باوجود ہمارے تاریخ گو شعرا نے اس فن میں اپنی استادانہ مہارت کے ایسے ایسے حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں کہ اگر انھیں "ادبی معجزہ" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بعض تاریخوں پر تو ان کے الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

اگرچہ تاریخ گوئی کا شمار شعری اصناف میں کیا جاتا ہے کیونکہ بالعموم مادۂ تاریخ کی پیش کش نظم کے پیرائے میں کی جاتی رہی ہے، مگر خال خال ایسی تاریخیں بھی مل جاتی ہیں جو نثر میں کہی گئی ہیں بعض تاریخیں قرآنی آیات سے بھی برآمد کی گئی ہیں جن کے مفہوم اور متعلقہ واقعات کی نوعیت میں بڑی پُر لطف اور حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اس تمہید کا مقصد تاریخ گوئی کے فنی نکات سے بحث کرنا ہرگز نہیں، بلکہ ان چند تاریخوں کی پیش کش ہے جو عالم اسلام کے اس شہنشاہ کی زندگی کے اہم واقعات پر کہی گئی ہیں جسے تاریخ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیرؒ کے نام اور لقب سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

ولادت حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ شاہجہاں کے تیسرے فرزند تھے۔ جہانگیر ان کی ولادت کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"روز شنبہ یازدہم[1]، بر گنہ دوحد[2] محل ورود	یعنی گیارہ تاریخ کو دوحد کا پرگنہ سعادتمند
موکب مسعود گشت۔ شب یکشنبہ دوازدہم	لشکر کا محل نزول بنا۔ یکشنبہ کی رات تیرہویں
آبان ماہ الٰہی، سنہ سیزدہ جلوس مطابق	سال جلوس کے آبان ماہ الٰہی کی بارہویں
پانزدہم ذیقعدہ ہزار و بیست ہفت	تاریخ مطابق ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ کو ....
ہجری..... بخشندۂ بی منت بفرزند	بے منت بخشنے والے (خدا) نے فرزند اقبالمند
اقبالمند شاہجہان از صبیۂ آصف خان گرامی	شاہجہاں کو آصف خاں کی بیٹی (کے بطن)

---

[1] آبان ماہ الٰہی سنہ سیزدہ جلوس جہانگیری [2] حضرت اورنگ زیب کو اپنے مولد دوحد سے بڑا جذباتی لگاؤ تھا۔ ایک مکتوب میں شاہزادہ محمد اعظم کو تاکید فرماتے ہیں: "قصبۂ دوحد از مضافات صوبۂ گجرات مولد این عاصی پرمعاصی است۔ رعایت سکنۂ آنجا واجب دانند۔" (رقعات عالمگیری، مطبع نولکشور کانپور، ۱۸۸۷ء: ص ۱۴)

فرزند گرامی فرمود، امید کہ قدمش برین — سے ایک فرزند گرامی عطا کیا۔ امید کہ اس کا قدم

دولت ابد قرین مبارک و فرخندہ باد۔"[1] — اس ابد پیوند حکومت کے لیے مبارک و با

سعادت ثابت ہوگا۔

چونکہ دوحد کی زمین اس قابل نہ تھی کہ "لائق جشن و ضیافت باشد" اس لیے حضرت اورنگ زیب

کا جشن ولادت چہارم ذی الحجہ کو شہر اجین میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا۔

شاہجہاں نے ایک خوانِ جواہر، مرصع آلات اور پچاس ہاتھی بادشاہ کی نذر کیے۔ "مولود

مسعود" کو بھی حضور میں پیش کیا اور تسمیہ کی التماس کی۔ اس مورد پر جہانگیر لکھتا ہے: "انشاء اللہ

نیک ساعت میں نام تجویز کیا جائے گا۔"[1] تزک میں نام تجویز کرنے کا ذکر تو نہیں ملتا لیکن

قرین قیاس یہی ہے کہ جہانگیر نے ان کا نام اورنگ زیب تجویز کیا۔ ابوطالب کلیم نے اس

واقعے سے کم از کم دس سال کے بعد حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے جس کے مادۂ تاریخ

سے بطریق تعمیہ ولادت کا سال ۱۰۲۷ھ برآمد ہوتا ہے:

داد یزدان بپادشاہ جہاں — خلفی ہمچو مہر عالمتاب

تاج صاحبقرانِ ثانی را — گوہر بحراز و گرفتہ حساب

نامش اورنگ زیب کردہ فلک — تخت ازین پایہ گشتہ عرش جناب

چون بایں مژدہ آفتاب انداخت — افسر خویش بر ہوا چو حباب

طبع دریافت سال تاریخش — زد رقم "آفتاب عالمتاب"[2]

مادۂ تاریخ "آفتاب عالمتاب" تعمیے کے ساتھ کہا گیا ہے۔ اس سے ۱۰۲۸ کا عدد

---

[1] تزک جہانگیری، جلد دوم، مطبع نولکشور لکھنؤ: ص ۲۵۱-۲ [2] ایضاً ص ۲۵۳

[2] دیوان ابوطالب کلیم، تصحیح و مقدمہ ح۔ پرتو بیضائی، کتابفروشی خیام ۱۳۳۶ شمسی: ص ۸۲

متخرج ہوتا ہے جبکہ حضرت اورنگ زیب کی ولادت کا سال ۱۰۲۷ھ ہے۔ چنانچہ کلیم نے چوتھے شعر میں

آفتاب کے اپنے تاج یعنی پہلے حرف (الف) کو ہوا میں گرا دینے کی بات کہہ کر ۱۰۲۸ میں سے الف

کے ایک عدد کے اسقاط کی جانب اشارہ کیا ہے۔

اس تاریخ پر تبصرہ فرماتے ہوئے میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ تعمیہ اسی بیت میں

ہونا چاہیے جو مادۂ تاریخ پر مشتمل ہو، ورنہ طبع نازک اسے پسند نہیں کرتی۔[1] انھوں نے بیت

آخر میں ہی تعمیے کی یہ صورت دریافت فرمائی ہے کہ "آفتاب عالمتاب" میں پہلا الف "رقم ہندسی" کی

صورت رکھتا ہے یعنی حرف الف اور ایک کے عدد کی مکتوبی شکل ایک جیسی ہے اور دونوں کی عددی

قدر بھی ایک ہے۔ اگر مصرع آخر میں "آفتاب عالمتاب" کو "زد" کا فاعل اور "رقم" کو اس کا مفعول

قرار دے دیا جائے تو مصرعے کی نثر علامت مفعول کے ساتھ ـــ آفتاب عالمتاب رقم را زد

ـــ ہوگی اور اس قرینے سے "آفتاب" کے الف اول کے اسقاط کی صورت نکل آئے گی۔ ممکن

ہے چودھری نبی احمد سندیلوی کے ذہن میں یہ نکتہ واضح رہا ہو کیونکہ انھوں نے اس قطعے

کو نقل کرتے ہوئے چوتھا شعر قلم انداز کر دیا ہے۔[2]

حضرت اورنگ زیبؒ کی تاریخ ولادت ـــ گوہر تاج ملوک اورنگ زیب ـــ ۱۰۲۷ھ سے

بھی کسی شاعر نے برآمد کی ہے۔[3] افسوس کہ شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

شاہجہاں کی تخت نشینی

بادی النظر میں شاہجہاں کی تخت نشینی خود اس کی زندگی کا

اہم ترین واقعہ ہے لیکن درحقیقت اس کی اہمیت حضرت اورنگ زیبؒ کی زندگی میں اس سے

کہیں زیادہ ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر نورجہاں اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتی اور

---

[1] خزانۂ عامرہ، مطبع منشی نولکشور، کانپور ۱۹۰۰ء: ص ۳۹۷ [2] واقعات عالمگیر، علی گڑھ ۱۳۴۸ھ/

۱۹۳۰ء: ص ۳ [3] مقدمۂ رقعات عالمگیر، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، اعظم گڈھ ۱۹۸۱ء: ص ۱۲۱

شہریار تخت و تاج کا برائے نام مالک بن کر اس کے اشاروں پر ناچتا تو ممکن تھا کہ حضرت اورنگ زیب بھی عام مغل شاہزادوں کی طرح زندگی بسر کرتے اور تاریخ اب تک انھیں فراموش کر چکی ہوتی۔ شاہجہاں ۸ رجمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کو اپنے خسر آصف خاں کی حکمت عملی اور حسن تدبر سے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا[1]۔ اس موقعے پر مسیح کاشی نے درج ذیل قطعۂ تاریخ تہنیت کے طور پیش کیا:

بادشاہ زمانہ شاہجہاں	خرم و شاد و کامران باشد
حکم او بر خلایق عالم	ہمچو حکم قضا روان باشد
بہر سال جلوس او گفتم	درجہان بادتا جہان باشد[2]

۱۰۳۷ھ

بقول میر غلام علی آزاد بلگرامی، اس کے صلے میں وہ بارہ ہزار روپے کے گراں قدر انعام سے سرفراز ہوا[3]۔

میر صالح خوشنویس نے "تاریخ اورنگ آرائی" اس طرح نظم کی:

تابود از عالم و آدم نشان	شاہ جہان بادشاہ جہان
کلک قضا سال جلوسش نوشت	شاہ جہان باشد شاہ جہان[4]

۱۰۳۷ھ

سعیدای گیلانی مخاطب بہ بے بدل خاں نے مصرع ذیل سے اس واقعے کی تاریخ برآمد کی:

---

[1] بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ اول، عبدالحمید لاہوری، کلکتہ ۱۸۶۷: ص ۸۰-۸۷ [2] ایضاً ص ۹۵
[3] آزاد بلگرامی نے صرف پہلا اور تیسرا شعر نقل کیا ہے (خزانۂ عامرہ: ص ۱۴۳ نیز سرو آزاد: ص ۹۰)
[3] خزانۂ عامرہ: ص ۱۴۳ — عبدالحمید لاہوری نے صلے کی رقم نہیں لکھی۔ صرف "تحسین و جائزہ کامیاب صورت و معنی گردید" لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ (بادشاہ نامہ، جلد اول حصہ اول: ص ۹۵) [4] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول: ص ۹۵

جلوس شاہجہان: ادہ زیب ملت و دین[1]

ان تاریخوں کے علاوہ صاحبان طبع نے — زینت شرع — ۱۰۳۷ھ اور — خدا حق بحق دار داد — ۱۰۳۷ھ سے بھی شاہجہانی جلوس کا سال برآمد کیا ہے[2]۔ شاہجہانی مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے عدد روز و نام روز و ماہ جلوس" یعنی — دوشنبہ بیست و ہشتم بہمن — ۱۰۳۷ھ سے تخت نشینی کا سال نکالا ہے[3]۔ اسے لفظی و معنوی تاریخ کے عمدہ نمونوں میں شمار کرنا چاہیے۔

ممتاز محل کا سانحۂ رحلت ابھی جلوس شاہجہانی کو صرف تین سال، پانچ ماہ اور دس دن ہی ہوئے تھے کہ حضرت اورنگ زیب کی مادر مشفق ملکہ نواب ارجمند بانو مخاطب بہ ممتاز محل نے ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۴۰ھ کو شہر برہان پور میں داعی اجل کو لبیک کہا[4]۔ اس وقت حضرت اورنگ زیب کو عمر کے تیرہ برس مکمل کیے ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے۔ یوں تو اس سانحے کی تاریخ لفظ "غم" سے نکالی گئی ہے لیکن سعیدای گیلانی مخاطب بہ بے بدل خاں نے — جای ممتاز محل جنت باد — ۱۰۴۰ھ سے مکمل سال برآمد کیا ہے[5]۔ یہ مصرع مادۂ تاریخ بھی ہے اور متوفیہ کے حق میں دعاے حسن عاقبت بھی۔

اس غمناک واقعے پر شاہجہانی ملک الشعرا ابو طالب کلیم نے بھی ایک رثائیہ رباعی لکھی ہے جس کے مصرع آخر سے ممتاز محل کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ رباعی یہ ہے:

از حق چو ندا شنیدہ ممتاز محل	زو دا زہمگی بریدہ ممتاز محل
رضوان در خلد بہر تاریخش گفت	فردوس محل گزیدہ ممتاز محل[6]

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ اول: ص ۹۵ [2] ایضاً [3] ایضاً — اس سے پہلے بابر کی ولادت کا سال "ششم محرم" سے نکالا گیا ہے۔ [4] بادشاہ نامہ، جلد اول۔ عبدالحمید لاہوری: ص ۳۸۴ [5] ایضاً: ص ۳۸۹ [6] دیوان ابو طالب کلیم کاشانی، تصحیح پرتو بیضائی: ص ۴۱۲ — دیوان میں (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶ پر)

دیوان ابو طالب کلیم (تصحیح و مقدمہ ح. پرتو بیضائی، ۱۳۳۶ شمسی) میں پانچ شعر کا ایک پُر اثر قطعہ "تاریخ فوت یکی از نوادگان شاہ" کے زیر عنوان شامل ہے جس کے مصرع آخر سے سال ۱۰۴۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ نوادہ کا اطلاق بلا تخصیصِ جنس پوتے، پوتی، نواسے اور نواسی بھی پر ہوتا ہے۔ جہاں تک شاہجہاں کا تعلق ہے، ۲۸ رجب ۱۰۴۳ھ تک نانا یا دادا بننے کی سعادت سے محروم تھا۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ح. پرتو بیضائی محولہ بالا قطعے کے سلسلے میں زبردست غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ غالباً ان کی گمراہی کا باعث قطعے کی افتتاحی بیت کا پہلا لفظ ہے۔ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

گوہری ارجمند از کف شاہ	رفتہ کز دیدہ خون نمی بندد
حاصل ہر دو کون شاہ جہاں	بد ہد گر بسلک پیوندد
رخت گلگون شفق نمی پوشد	کہ بر جز سیاہ نپسندد
آسمان بر سر از مہ و خورشید	چرۂ زرد دگر نمی بندد

گفت تاریخ این معیبت عام

صبحدم زین الم نمی خندد[2]

۱۰۴۰ھ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۵) قوافی شنید، برید اور گزید نقل ہوئے ہیں۔ اس صورت میں مصرع تاریخ سے ۱۰۳۵ برآمد ہوتا ہے جو درست نہیں، ممتاز محل کا سال وفات ۱۰۴۰ھ ہے۔ اگر قوافی کو شنیدہ، بریدہ اور گزیدہ کی صورت میں لکھا جائے (اور کلیم نے یقیناً قوافی اسی شکل میں باندھے ہونگے) تو مطلوبہ سال کے عدد میں پانچ کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ فاضل مرتب دیوان شاہجہانی عہد کی کسی بھی تاریخ کی ورق گردانی کر لیتے تو اس سہو کے مرتکب نہ ہوتے۔

[1] ۲۸ رجب ۱۰۴۳ھ کو دارا شکوہ ایک بیٹی کا باپ اور شاہجہاں دادا بنا۔ (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ ب: ص ۴۳)

[2] دیوان ابو طالب کلیم کاشانی (پرتو بیضائی)، ص ۷۷ - ۷۶

یہ سچ ہے کہ لفظ گوہر استعارے کے بطور اولاد یا "نوادہ" کے لیے زیادہ مناسب ہے، مگر کیا شاہجہاں کی عزیز از جان ملکہ جس کی محبت کی نشانی اس نے روضۂ تاج جیسی حسین و بے نظیر عمارت کی صورت میں یادگار چھوڑی ہے، اس کے لیے "گوہر ارجمند" کا درجہ نہیں رکھ سکتی تھی؟ گوہر کے ساتھ لفظ "ارجمند" اس سوال کا مثبت جواب ہے۔ علاوہ بریں آخری شعر میں "معیبت عام" کی ترکیب کسی زبردست کہرام کے برپا ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ ایسا کہرام جو بادشاہ اور ولی عہد کے بعد کسی ہر دلعزیز ملکہ کی موت پر برپا ہو سکتا ہے۔ قرائن و براہین سے اس قیاس کو خاصی تقویت پہنچتی ہے کہ منقولہ بالا قطعۂ تاریخ ممتاز محل ہی کی وفات پر کہا گیا ہے۔ تاریخ کے صفحات سے بھی ۱۰۴۰ھ میں اس حادثے کے علاوہ کسی اور غم انگیز سانحے کے شاہی خاندان میں رونما ہونے کی خبر نہیں ملتی۔

کتخدائی

ماہ ربیع الثانی ۱۰۴۵ھ میں حضرت اورنگ زیب ججھار سنگھ کے فتنے کا سر کچلنے کے لیے دکن روانہ کیے گئے۔[1] اس مہم میں انھیں سرخ روئی حاصل ہوئی لہذا ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۴۵ھ کو انھیں دکن کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔[2] اس واقعے کو ابھی ایک سال کا بھی عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شاہجہاں نے انھیں آگرہ طلب کیا۔ ان کا رشتہ ایران کے سابق امیر میرزا رستم خاں کے بیٹے شاہنواز خاں کی بیٹی دلرس بانو سے طے ہو چکا تھا۔ شادی کی تاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۱۰۴۶ھ مقرر کی جا چکی تھی۔ اس دن نہایت تزک و احتشام سے جشن کتخدائی برپا ہوا۔ شاہجہاں بنفس نفیس موجود تھا۔[3] ملک الشعرا ابو طالب کلیم نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا جس کے مصرع آخر سے بطریق تعمیہ سال ۱۰۴۶ھ نکلتا ہے:

[1] بادشاہ نامہ جلد اول، حصہ دوم: ص ۹۹ [2] مقدمہ رقعات عالمگیر۔ سید نجیب اشرف ندوی: ص ۹ - ۱۰ [3] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم: ص ۲۶۹

جہان کردہ سامانِ بزم نشاطی | کہ گلبانگ عیشش بگردوں رسیدہ
قران کردہ سعدین وزینسان قرانی | فرح خیز و فرخندہ دوران ندیدہ[1]
زپیونداین گلبن باغِ دولت | زمانہ گل عیش جاوید چیدہ
فلک رتبہ اورنگ زیب آنکہ ایزد | سزاوار تایید غیبش دیدہ
بجلی کہ اقبال اورو نہادہ[2] | ظفر پیش از آوازہ آنجا رسیدہ
نہال برومند بستانِ دولت | کہ اقبال درسایہ اش آرمیدہ

خرد بہر تاریخ تزویج گفتا
دو گوہر بیک عقد دوران کشیدہ[3]

مصرع آخر سے از روے حساب جمل ۱۰۴۷ حاصل ہوتا ہے جبکہ مطلوبہ سال ۱۰۴۶ھ ہے۔ آقای پرتو بیضائی نے نہ جانے کس حساب سے ۱۰۴۹ھ ثبت کیا ہے[4]۔ سید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے اس مصرعے کے نیچے ۱۰۴۶ھ تحریر فرمایا ہے[5]۔ لیکن مصرعے سے متخرج ہونے والے عدد (۱۰۴۷) میں ایک کی تخفیف کا سبب بیان نہیں کیا۔ محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم اس واقعے کا سال تو ۱۰۴۶ھ تحریر فرماتے ہیں مگر مصرع تاریخ کے نیچے خط کھینچ کر ۱۰۴۷ھ رقم فرماتے ہیں[6]۔ جناب نبی احمد سندیلوی صاحب نے صرف مصرع تاریخ نقل کرکے اس کے آگے قوسین میں "۱۰۴۷ ہجری" تحریر فرمایا ہے[7]۔ گویا وہ حضرت اورنگ زیب کی ترویج کو ۱۰۴۷ھ کا واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل یہ تاریخ اتنے لطیف، مبہم اور داخلی نوعیت کے تعمیے کے ساتھ

[1] دیوان کلیم کاشانی میں — فرح خیز و پر یمن دوران ندیدہ — چھپا ہے۔ (ص ۸۴) [2] یہ شعر بادشاہ نامہ میں نہیں ہے۔
[3] دیوان ابوطالب کلیم کاشانی (تصحیح پرتو بیضائی): ص ۸۴ [4] ایضاً [5] مقدمۂ رقعات عالمگیر، اعظم گڈھ ۱۹۸۱: ص ۱۵۴
[6] بزم تیموریہ، جلد دوم، اعظم گڈھ ۱۹۸۰: ص ۸۰ — ۱۰۹ [7] وقایع عالمگیر، علی گڈھ ۱۹۳۰: ص ۱۵۵

کی گئی ہے کہ مطلوبہ سال تک ذہن کی رسائی فوراً نہیں ہو پاتی۔ تعمیے کی صورت یہ ہے کہ زمانے نے دو گوہروں کو ایک رشتے میں پرو کر ایک کر دیا۔ اس قرینے سے ایک گوہر (یعنی ایک عدد) حساب سے خارج ہو گیا۔ (۱۰۴۷ — ۱ = ۱۰۴۶)۔

تخت نشینی

حضرت اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کا واقعہ ہندوستان کی مغل تاریخ کا جتنا دلآویز واقعہ گذرا ہے، متعصب اور جانب دار مورخین نے اس کی صورت مسخ کرنے پر اتنا ہی اپنے قلم کا زور صرف کیا ہے۔ چونکہ اس واقعے کی تفصیل نفس موضوع سے خارج ہے اس لیے سرسری اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شاہجہاں کو اعتراف تھا کہ اس کے چاروں بیٹوں میں حضرت اورنگ زیبؒ ہر لحاظ سے "متحمل امرِ خطیرِ ریاست" ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے[1] اس کی نظر میں دارا "عدوی نیکان و دوست بدان" واقع ہوا تھا[2]۔ اس کے باوجود وہ دارا کی محبت میں اندھا ہو کر اس کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اسے اپنا جانشین نامزد کر چکا تھا۔ گویا اس شہنشاہ کو جو اپنے دور حکومت میں دین پرور اور دین پناہ بنا رہا، اس بات کی قطعی فکر نہیں رہ گئی تھی کہ اس کے بعد اس کا نامزد ولی عہد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو شاہجہاں عسر البول، قبض طبیعت اور کثرت مواد دموی کے عوارض میں مبتلا ہوا[3]۔ دارا نے عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی اور بعض ایسے اقدامات کیے[4] جن سے شجاع، حضرت اورنگ زیبؒ اور مراد کے دلوں میں شبہہ پیدا ہوا کہ وہ تخت و تاج

[1] اور [2] رقعات عالمگیری، مطبع نولکشور کانپور ۱۸۷۸ء: ص ۳۴ [3] عمل صالح جلد سوم، کلکتہ: ص ۲۶۴ [4] مثلاً ابواب رسل و رسایل کا انسداد اور شجاع، حضرت اورنگ زیبؒ اور مراد کے وکیلوں کو قید کر لینا۔

پر متصرف ہوگیا۔ چنانچہ ان تینوں میں اتحاد ہوگیا۔ انھوں نے آگرے کی جانب پیش قدمی کی۔ شجاع الہ آباد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن حضرت اورنگ زیبؒ اور مراد دھرمت کے میدان میں جسونت سنگھ کو اور سموگڑھ کے مقام پر دارا کو شکست دے کر آگرہ پہنچ گئے۔ دارا دہلی کی طرف بھاگ نکلا۔ حالات سے مجبور ہو کر حضرت اورنگ زیبؒ نے شاہجہاں کو قید کر دیا۔ پھر وہ دارا کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اسی دوران مراد کی نیت میں فتور آگیا[1]۔ لہذا اسے بھی قید کرنا پڑا۔ دہلی کے نواح میں پہنچ کر بہادر خاں اور خلیل اللہ خاں کو دارا کے تعاقب پر مامور کرکے خود قلعے کے باہر باغ شالامار میں فروکش ہوگئے اور یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ کو جشن جلوس برپا کیا[2]۔ اس موقعے پر بہت سے صاحب کمالوں نے تاریخیں کہیں[3]۔ ان میں حیرت انگیز اور بے مثال تاریخ جسے واقعات کی نوعیت کے پیش نظر الہامی تاریخ کہیں تو بے جا نہ ہوگا، سید عبدالرشید ٹھٹھوی نے کلام اللہ کی آیت کریمہ:

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء، ۵۹)

(اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اس کی جو صاحب امر (حاکم) ہو تم میں)

سے برآمد کی[4]۔ اس سے بے کم و بیش سال ۱۰۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ ایک صاحب طبع نے جلوس میمنت کی تاریخ "سزاوار سریر پادشاہی" جیسے بلیغ الفاظ سے نکالی[5]۔

---

[1] یہ بھی حضرت عالمگیر کے خلاف شاہجہاں کی ایک چال تھی جس میں مراد خود پھنس گیا۔ ملاحظہ فرمائیے "رقعات عالمگیر (مرتبہ نجیب اشرف ندوی) رقعۂ شاہجہان بنام مراد بخش: ص ۳۰۸ [2] منتخب اللباب، جلد دوم، خافی خاں: ص ۴۰-۳۹ [3] مقدمۂ رقعات عالمگیر، سید نجیب اشرف ندوی: ص ۸۰، [4] مآثر عالمگیری، مستعد خاں (ترجمہ از فدا علی طالب): ص ۶- خافی خاں نے تاریخ گو کا نام نہیں دیا (منتخب اللباب جلد دوم: ص ۴۰) [5] ایضاً (کتاب میں "سرفراز سریر بادشاہی" چھپا ہے جس سے سال ۱۳۴۲ نکلتا ہے۔ غالباً "سزاوار" سہو کتابت سے "سرفراز" بن گیا۔)

اس موقعے پر خود حضرت اورنگ زیبؒ نے بھی ابوطالب کلیم کے کہے ہوئے اپنی ولادت کے مادۂ تاریخ میں "م" کا اضافہ کرکے اپنی تاریخ جلوس "آفتاب عالمتابم" کی صورت میں کہی[1]۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تاریخیں کہی گئی ہیں۔ ان سب کو مجتمع کرکے مسٹر بیل نے "مفتاح التواریخ" کے نام سے کتابی شکل دے دی ہے[2]۔

کھجوا کی جنگ

تخت نشینی کے جشن کے بعد حضرت اورنگ زیبؒ دارا کے تعاقب میں چل پڑے۔ ملتان پہنچ کر انھیں خبر ملی کہ شجاع جو دارا کی شکست کو نعمت غیر مترقبہ تصور کر رہا تھا، شاہجہاں کی شہ پا کر نقض عہد پر آمادہ ہوگیا ہے[3]۔ اور آگرے کی طرف بڑھ رہا ہے لہذا شیخ میر اور دلیر خاں کو دارا کا تعاقب جاری رکھنے کی ہدایت دے کر وہ برق رفتاری سے الہ آباد کی طرف بڑھے اور کھجوا کے مقام پر پہنچ کر، ۱ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو اس کے مقابل صف آرا ہوگئے۔ میرزا روشن ضمیر نے "بقول آزاد بلگرامی" درعین معرکہ[4] اور بروایت خافی خاں "ہنگامیکہ سوار می شدند"[5] مادۂ تاریخ کی حامل یہ دعائیہ رباعی نذر کی:

ای عزِ تو سورۂ تبارک بادا — پیوستہ ترا تاج تبارک بادا

جستم ز پی شگون فتحت تاریخ — دل گفت: شود فتح مبارک بادا

۱۰۶۹ھ

تاریخ گوئی کی روایت میں یہ دعائیہ تاریخ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتی ہے۔ "تاریخِ واقعہ قبل از وقوع" کی یہ نادر الوجود مثال ہے جس کے ساتھ ہی اسے میرزا روشن ضمیر کی روشن ضمیری کی آئینہ دار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ انھی کی دعا مستجاب ہوئی۔ حضرت

---

[1] خزانۂ عامرہ، طبع نولکشور: ص ۳۹ [2] مقدمۂ رقعات عالمگیر: ص ۸۰،۴ [3] شاہجہاں نے شجاع کو اورنگ زیب پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ہندی میں خطوط لکھے تھے (رقعات عالمگیر: ص ۲۱۸) نیز منتخب اللباب جلد دوم: ص ۴۳ [4] خزانۂ عامرہ: ص ۹۷ [5] منتخب اللباب جلد دوم: ص ۵۰

اورنگ زیب نے اسے مبلغ پانچ ہزار روپے کے انعام سے نوازا۔[1]

جشن جلوس ثانی

حضرت اورنگ زیبؒ کا پہلا جشن جلوس ایک رسمی کارروائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کھجوا کے میدان میں شجاع کو شکست دینے کے تقریباً تین ماہ بعد ان کا جشن جلوس ثانی نہایت تزک و احتشام کے ساتھ برپا ہوا۔ (۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ) اس موقعے پر سکے، خطبے اور لقب کا تعین ہوا۔ حکم صادر ہوا کہ ان کا نام نامی منشور حکومت میں "ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" کے القاب کے ساتھ تحریر کیا جائے۔[2] اس مبارک تقریب پر ملا عزیز اللہ خلف ملا تقی اصفہانی نے کلام الٰہی سے یہ تاریخ نکالی:

اِنَّ المُلکَ لِلّٰہِ یُؤتیہِ مَن یَّشَاءُ[3] (۱۰۶۹ھ)

(ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔)

اس کے علاوہ دیگر نکتہ سنجوں نے بھی تاریخیں کہیں۔ ایک صاحب طبع نے "بادشاہ ملک ہفت اقلیم" سے اس تقریب کا سال برآمد کیا۔[4] (۱۰۶۹ھ)

دارا کے پیرو مرشد ملا شاہ بدخشی نے حضرت عالمگیر کے جلوس ثانی کی تاریخ "ظل الحق"[5] نکالی اور اسے ایک رباعی میں نظم کر کے عالمگیری بارگاہ میں بھیجا اور اس طرح رسم تہنیت ادا کی:

صبحی دل من چون گل خورشید شگفت[6] · کامد حق و غبار باطل رارُفت[7]

تاریخ جلوس شاہ حق آگہ را[8] · "ظل الحق" گفت الحق این راحق گفت[9] (۱۰۶۹ھ)

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم میں بقول "زاد بلگرامی ہزار روپیہ صلہ ہمان ساعت مرحمت گردید" (خزانۂ عامرہ: ص، ۲۹) [2] مآثر عالمگیری، مستعد خاں (اردو ترجمہ از فدا علی طالب) حیدرآباد دکن: ص ۱۶ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] خافی خاں جلد دوم: ص ۷۹۔
[6] صبح دل من بجائے صبحی دل من۔ مرآۃ الخیال، بمبئی: ص ۱۲۹۔ [7] حق ظاہر شد بجائے کامد حق۔ ایضاً [8] ایضاً۔ شاہ اورنگ آرا بجائے شاہ حق آگہ را [9] منتخب اللباب جلد دوم: ص ۷۹

شیر خاں لودی اس رباعی کی غایت تخلیق یہ بیان کرتا ہے:

"حضرت عالمگیر شاہ بعد از انزوای شاہجہان و قتل دارا شکوہ ملا شاہ را بحضور طلب فرمود وی از کشمیر برنمی آمد تا آنکہ صاحب صوبہ آنجا بعنف برآورد و ملا در اثنای راہ یک رباعی مشتمل بر تاریخ جلوس گفتہ بدار السلطنۃ دہلی فرستاد بمطالعۂ ظل الٰہی در آمد تکلیف حضور موقوف گردید و حکم شد کہ در لاہور باشد۔"[1]

حضرت عالمگیر شاہ نے شاہجہاں کی زاویہ گزینی اور دارا شکوہ کے قتل کے بعد ملا شاہ کو حضور میں طلب فرمایا اور وہ کشمیر سے نہیں نکل رہے تھے یہاں تک کہ وہاں کے صوبہ دار نے سختی سے نکالا۔ اثنائے راہ میں ملا نے تاریخ جلوس پر مشتمل ایک رباعی کہہ کر دار السلطنت دہلی روانہ کی۔ جب وہ ظل الٰہی کے مطالعے میں آئی تو حاضری کا حکم موقوف ہو گیا اور حکم ہوا کہ وہ لاہور میں رہے۔

اس بیان کی تائید کسی مستند ماخذ سے نہیں ہوتی۔ خافی خاں کے بیان سے صاف مترشح ہے کہ ملا شاہ نے یہ رباعی جبر و اکراہ سے نہیں کہی۔[2] اس واقعے میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو خافی خاں اسے حاشیہ آرائی کے ساتھ بیان کرنے سے ہرگز نہ چوکتا۔

اب اس رباعی پر دونوں کے تبصرے بھی ملاحظہ ہوں۔ خافی خاں کے خیال میں یہ رباعی:

"خالی از انداز تصوف و اشارۂ ابطال ارادتِ مرید کامل نیست۔"[3]

تصوف کے انداز اور مرید کامل کی ارادت کے ابطال کے اشارے سے خالی نہیں۔

جبکہ شیر خاں لودی کے بقول:

"اگر بنظر تعمق نگاہ کنند دریابند کہ فی الحقیقۃ تمام رباعی در توصیف خود گفتہ وضمناً بادشاہ"

اگر گہری نظر سے دیکھیں تو علم ہوگا کہ درحقیقت انھوں نے پوری رباعی اپنی مدح میں کہی ہے"

---

[1] مرآۃ الخیال، مطبع مظفری بمبئی: ص ۱۲۹ [2] منتخب اللباب جلد دوم: ص ۸۰، [3] ایضاً: ص ۸۰۔

وا ممنون ساخت[۱] — اور ضمناً بادشاہ کو ممنون کیا۔

شیر خاں کا ارشاد بجا، مگر ارباب نظر ایک نگاہ رباعی پر پھر ڈالیں اور فیصلہ فرمائیں کہ:

(۱) ملا صاحب کے دل کا سورج مکھی پھول کی طرح مکمل اٹھنا کس واقعے پر ان کی خوشی کا اظہار ہے؟

(۲) حضرت اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی اور داراشکوہ کے قتل کے تناظر میں کیا حق کی آمد سے حضرت عالمگیرؒ کا برسر اقتدار آنا اور "غبار باطل" کی صفائی سے دارا جیسے بدعقیدہ شخص[۲] کا ازالہ مراد نہیں؟

یہ بھی ملحوظ رہے کہ "شاہ حق آگہ" کے جلوس کی تاریخ "ظل الحق" سے برآمد کرکے ملا صاحب اعتراف فرماتے ہیں کہ "الحق این راحق گفت"۔ پوری رباعی میں اسی فقرے کو ملا صاحب کی خود اپنی مدح پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

حفظ قرآن

ہندوستان پر مغل فرمانرواؤں نے تقریباً سوا تین سو سال حکومت کی۔ اس عرصے میں حضرت اورنگ زیبؒ کی حکومت کے پچاس سال دو مہینے اور انیس ۱۹ دن کو مغل تاریخ کا سب سے زیادہ تابناک اور پرشکوہ دور شمار کرنا چاہیے۔ اس شہنشاہ دین پناہ نے علم و عمل کے توافق سے ملک کے طول و عرض میں ایک ایسی دینی فضا پیدا کر دی تھی جس کی مثال ہندوستان کے اسلامی دور حکومت میں مفقود ہے۔ ان کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہے اور خود ان کا مہتم بالشان ذاتی کارنامہ حفظ کلام اللہ کی سعادت کا حصول۔ اس خصوص میں محمد ساقی مستعد خاں لکھتا ہے:

۱؎ مرآۃ الخیال: ص ۳۰-۱۲۹ ۲؎ راقم السطور کے مضامین "داراشکوہ کے خواب" (معارف فروری ۱۹۸۸) اور "کیا داراشکوہ مسیحی تھا" (معارف، ستمبر ۱۹۸۸ء) ملاحظہ فرمائیں۔

"واز جلایل فضایل آن خدیو یزدان پرست توفیق حفظ کلام ملک علام است۔ اگرچہ از مبادی حال دولت و اقبال برخی از سورۂ کریمۂ قرآنی با رعایت مراتب قرأت محفوظ خاطر اقدس بود لیکن مجموع حفظ کلام اللہ بعد جلوس براورنگ سلطنت اتفاق افتاد و بجہد تمام و عزم ملوکانہ بر لوحۂ خاطر اشرف صورت ارتسام گرفت۔ تاریخ شروع حفظ شریف از عدد حروف (آیۂ) کریمہ سنقرئک فلا تنسیٰ[۱] بحساب جمل پردہ از رخ میکشاید و تاریخ اتمامش از اعداد لوح محفوظ[۲] جلوۂ ظہور می نماید"[۳]

اس خدا پرست بادشاہ کے فضائل جلیلہ میں سے ایک کلام ملک علام کے حفظ کی توفیق ہے۔ اگرچہ حکومت و اقبال کے ابتدائے حال ہی سے قرآن کریم کی سورتوں میں سے کئی (سورتیں) آداب قرأت کی رعایت کے ساتھ خاطر اقدس میں محفوظ تھیں لیکن کلام اللہ کے تمام و کمال حفظ کا اتفاق تخت سلطنت پر جلوس کے بعد ہوا۔ پوری کوشش اور شاہانہ عزم سے وہ دل شریف کی تختی پر نقش ہوگیا۔ حفظ شریف کے آغاز کی تاریخ آیت کریمہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کے حروف کے اعداد سے از روئے حساب جمل چہرے سے پردہ اٹھاتی ہے اور اختتام کی تاریخ لوح محفوظ کے اعداد سے جلوۂ ظہور دکھاتی ہے۔

مستعد خاں نے حفظ کلام اللہ کے آغاز و اختتام کے صرف مادہ ہائے تاریخ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، نہ ان مادوں سے برآمد ہونے والے سال تحریر کیے ہیں نہ اس سعادت کی مدت حصول بیان کی ہے۔ جہاں تک مادوں کا تعلق ہے اول الذکر سے سال ۱۰۷۱ھ اور

۱؎ ہم تمہیں پڑھوائیں گے پھر تم نہیں بھولو گے (قرآن کریم سورۃ الاعلیٰ - ۶/۸۷) ۲؎ قرآن کریم سورۃ البروج ۸۵/۲۲، ۳؎ مآثر عالمگیری، تصحیح آغا احمد علی، کلکتہ ۱۸۷۱ء: ص ۵۳۲۔

تانی الذکر سے ۱۰۷۰ھ برآمد ہوتا ہے جو بالترتیب حضرت اورنگ زیبؒ کے حفظ قرآن کی ابتدا اور تکمیل کی تاریخیں ہونی چاہئیں لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اس باب میں جن ارباب قلم کے بیانات نظر سے گذرے ہیں وہ آغاز حفظ کا سال تو ۱۰۷۱ھ بیان کرتے ہیں مگر تکمیل حفظ کا سال (نہ جانے کس حساب سے) ۱۰۷۲ھ نقل فرماتے ہیں اور وہ بھی اس صراحت کے ساتھ کہ یہ کارنامہ صرف ایک سال کی مدت میں انجام پذیر ہوا۔ مثلاً سید نجیب اشرف ندوی مرحوم رقمطراز ہیں:

"یہ اس کی (اورنگ زیبؒ کی) پہلی ریاضت یا رسم شکر الٰہی تھی جو اس نے تاجدار ہونے پر اس معبود تاج بخش کی خدمت میں پیش کی۔ ابتدائے حفظ قرآن کی تاریخ سنقرئک فلا تنسیٰ (۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء) اور اختتام کی "لَوحِ محفوظ" (۱۰۷۲ / ۱۶۶۲) سے نکلتی ہے۔ ایک سال کے اندر کلام مجید کو حفظ کر لینا.... اس کی قوتِ حافظہ کی بیّن دلیل ہے"۔[1]

اسی طرح سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم فرماتے ہیں:

"یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی۔ ۱۰۷۱ھ میں حفظ کرنا شروع کیا اور ۱۰۷۲ھ میں ختم کیا"۔[2]

محمد کاظم بھی (جس کی تاریخ عالمگیر نامہ میں بیان شدہ عہد عالمگیر کے ابتدائی دس سال کے واقعات کا خلاصہ مستعد خاں نے مآثر عالمگیری میں شامل کیا ہے) مدتِ حفظ کی صراحت سے گریز کرتے ہوئے صرف "در عرض اندک وقتی و مختصر زمنی" لکھ کر گذر جاتا ہے۔

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر: ص ۱۲۹ [2] بزم تیموریہ جلد سوم: ص ۷

اگر تکمیل حفظ کی درست تاریخ ۱۰۷۲ھ ہی ہے (اور راقم السطور کی دسترس میں کم از کم ایک ایسی شہادت ہے جو اس کے درست ہونے پر دلالت کرتی ہے) تو لازماً مادۂ تاریخ "لوح محفوظ" کو بطریق تعمیہ منظوم ہونا چاہیے جس میں تاریخ گو نے چھ کے عدد کی تخفیف کا کوئی قرینہ رکھ چھوڑا ہوگا۔

تکمیل حفظ کے مادے سے متخرج ہونے والے سال ۱۰۷۸ پر جناب نجیب اشرف ندوی اور محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے مبیّنہ سال ۱۰۷۲ھ کے مرجح اور قرین صحت ہونے کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ جب حضرت اورنگ زیبؒ نے حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل فرمائی تو میرزا روشن ضمیر نے درج ذیل دعائیہ رباعی تہنیت کے طور ان کی خدمت میں پیش کی:

محی الدین و مصطفیٰ حافظ تو — صاحب سیفی و مرتضیٰ اکرم حافظ تو
تو حامی شرع و حامی تو شارع — تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

اس کے صلے میں اسے سات ہزار روپیے مرحمت ہوئے۔[1] اس واقعے کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ میرزا روشن ضمیر نے ۱۰۷۷ھ میں بمقام بندر سورت وفات پائی۔[2] اس تناظر میں مادۂ تاریخ سے برآمد ہونے والا سال (۱۰۷۸ھ) مشتبہ قرار پاتا ہے۔ ساتھ ہی اس قیاس کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ تکمیل حفظ کا مادۂ تاریخ تعمیے کے ساتھ کہا گیا ہوگا۔ مستعد خاں نے صرف "لوح محفوظ" نقل کیا ہے۔ اس کی وجہ فن تاریخ گوئی کے رموز و غوامض سے اس کی عدم واقفیت بھی ہو سکتی ہے اور سہل انگاری اور بے احتیاطی بھی۔

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۲۹۸ — باغ معانی، نقش علی، مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ: ص ۱۲۲

[2] ایضاً: ص ۲۹۷ — ایضاً ، ص ۱۲۲

تصوف وسلوک شاہ ہمدان کی تحریروں میں

از

پروفیسر سید وحید اشرف شعبۂ فارسی مدراس یونیورسٹی

(۲)

حضرت سید علی ہمدانی کی اکتالیس غزلیں چہل اسرار کے نام سے موسوم ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں اصلاً چالیس غزلیں ہی رہی ہوں۔ بہر حال چہل اسرار نام سے ظاہر ہے کہ اس میں انھوں نے طریقت کے اسرار بیان کیے ہیں۔ غزل کے موضوعات بظاہر یکساں ہیں اور سب غزلوں میں بہت سے موضوعات مشترک ہیں مثلاً عشق، خود فراموشی، تجرید و تفرید، فنا و بقا۔ لیکن ہر غزل میں کوئی ایسا بیان بھی ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید علی ہمدانی اس میں تصوف کا کوئی نیا نکتہ پیش کر رہے ہیں جو زیادہ تر دوسری غزلوں میں نہیں ہے۔ ان غزلوں میں حسن شعری بھی موجود ہے اس کے ساتھ ہی تعلیمات وخیالات واضح ہیں۔ ان میں حقیقت ومجاز کی آمیزش بہت کم جگہوں پر ہے۔ اس لیے طریقت کو سمجھنے کے لیے حضرت علی ہمدانی کی یہ غزلیں بھی بہت معاون ہیں۔ ہم ہر غزل میں سے ایک دو شعر یہاں پیش کرکے یہ اشارہ کریں گے کہ حضرت علی ہمدانی نے اس میں کیا تعلیم پیش کی ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں میں تعلیمات بتدریج اور سلسلہ وار نہیں ہیں۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں کی ترتیب درست نہیں ہے۔ اگر زیادہ دقت نظر سے کام لیا جائے تو ممکن ہے کہ ان غزلوں میں کوئی ایسی ترتیب

پیدا کی جاسکے جس سے تعلیمات میں تدریج کا اندازہ ہوسکے۔ لیکن فی الحال ہم اسی ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہیں جو پیش نظر مطبوعہ نسخہ میں ہے۔

پہلی غزل میں چند اشعار مجازی انداز میں بھی ہیں۔ اس میں وہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا تک رسائی خدا کے فضل پر موقوف ہے اور اس کی ذات کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔

عقول قدسیاں گم گشتہ اندر یک خم زلفش ‏ ‏ ‏ زمشتی خاکیان آنجا چہ سنجد این مقالتہا

وہ کہتے ہیں کہ عشق سرمایۂ زندگی ہے:۔

مُہرِ مہرِ او بس است ای دل دم از وصلش مزن ‏ ‏ ‏ سایہ را خورشید جُستن کے بود رأی صواب

اس شعر میں وصل کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی غزل میں وصل کو صوفیہ کے اصطلاحی معنی میں بھی استعمال کیا ہے:۔

باصفای لذت دردش نعیم خلد، ہیچ ‏ ‏ ‏ باخیال دولت وصلش ہمہ عالم سراب

اس عشق میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو جان کی بازی لگا دے اور اس جان کی بازی لگانے میں اور بلاؤں کے برداشت کرنے میں لذت محسوس کرے۔

گر ہمہ خلق جہان از سر زر برخیزند ‏ ‏ ‏ دولتِ وصل تو آن یافت کہ از سر برخاست

لذت عمر دل از ضرب بلاہای تو دید ‏ ‏ ‏ زانکہ از دوست جفا خلعتِ ارباب وفاست

خدا سے عشق کی دلیل یہ ہے کہ عاشق کو خدا کی مخلوق سے بھی محبت ہو:۔

کفر و دین و نور و ظلمت در جہان ‏ ‏ ‏ از رخِ ماہ و شب گیسوی اوست

ہر گلے کو رُست در باغِ وجود ‏ ‏ ‏ آب حیوانِ ہمہ از جوی اوست (غزل ۲)

عاشق عشق میں اس درجہ غرق ہوجائے کہ فنا فی اللہ ہوجائے:۔

بہ دریای فنا انداز خود را ‏ ‏ ‏ کہ آنجا صورتِ لا و نعم نیست

دلی نابود تو شرط است این جا — کہ ہرگز آفتاب و شب بہم نیست (غزل ۵)

جس پر حقیقت کھل جاتی ہے وہ دنیا کی خوشی اور غم کے احساس سے اپنے کو آزاد کرلیتا ہے:۔

سری کز ہر معنی با خبر شد — درو گنجایش شادی و غم نیست (غزل ۶)

یہ ایک سِرّ الاسرار ہے کہ مظاہر دنیا خدا کی صفات کے ظل وعکس ہیں:۔

جہان از عکس رویش گشتہ روشن — اگر اکمہ نبیند ہیچ غم نیست (غزل ۶)

جس کو خدا کے عشق کی لذت ملتی ہے اسے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے:۔

لذت درد تو ہر مردہ دلی کی یابد — دولت آن یافت کہ از درد تو جانی یابد (غزل ۷)

خدا کو پانے کے لیے خود اپنے اندر سفر کرنا چاہیے:۔

گر نہ پیمودن آفاق این دولت سود حاصل — کسی را زیبد این معنی کش اندر خود سفر باشد (غزل ۸)

عشق الٰہی سے انسان کو عزّ و شرف حاصل ہوتا ہے:۔

ہر کہ او در کوی وحدت جان خود را ساخت نعق — رایت عزّ و شرف را تا ثریا میکشد (غزل ۹)

عاشق خدا پر غیب شہود ہو جاتا ہے:۔

در مجلس شہود نشستہ ملوک دار — ذوقی ز جام انس بصد جان خریدہ اند (غزل ۱۱)

خدا کی یاد میں عاشق ایسا مست رہتے ہیں کہ معشوق حقیقی سے جو بلائیں نازل ہوتی ہیں اس میں وہ آرام اور خوشی محسوس کرتے ہیں:۔

مستان حضرتش دل آرام اگر بلا شد — باصد ہزار محنت بریاد دوست شادند

جناب کبریائی تک رسائی کے لیے ساری دنیا کو دل سے نکال دینا چاہیے:۔

تا ازین ظلمت سرای تیرہ حرمان نگذرد — دست ہمت در جناب کبریائی چون زند (غزل ۱۲)

فنا کے بعد بقا کی دولت حاصل ہوتی ہے:۔

چون در ریاض انس شراب بقا چشند — خوش تیغ ترک بر رخ دار الفنا زنند (غزل ۱۳)

لذت وصل ایک لمحاتی کیفیت ہے:۔

گردی وصلش بصد جانت میسر میشود — رو گران جانی مکن چون دوست ارزان میکند (غزل ۱۴)

وصل ایک ایسی کیفیت ہے جس میں عاشق کو اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ اس کیفیت کے حصول کے بعد عاشق اشیا کی تسبیح سن سکتا ہے:۔

سدِّ این راہ ملائیست اگر برخیزد — صوت تسبیح وی از صخرہ صمّا شنود (غزل ۱۵)

عاشق کو ہر شئے میں خدا کا نور نظر آتا ہے:۔

عاشقان عکس رخت در ہمہ اشیا بہ بینند — سرّ سودای تو در سینہ ہویدا بینند (غزل ۱۶)

فنا کے بعد عاشق خارج اور باطن میں خدا کی نشانیاں دیکھتے ہیں اور انھیں اس کا شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ ہر شئے اسی کی کسی صفت کا ظل وعکس ہے:۔

از وجوہ سر ہمہ خطا اسماء خوانند — پس بتحقیق ہمہ عین مسمّیٰ بینند

ہر چہ ہست آن ہمہ آئینہ ذات دانند — روی مقصود در آن آئینہ پیدا بینند (غزل ۱۶)

عاشق کو دنیا کی نیکنامی اور بدنامی کے خیال سے بے پروا ہونا چاہیے:۔

نیکنامی بایدت پیرامنِ این در مگرد — ہر کہ روی مہ بگل پوشد سبک رسوا شود (غزل ۱۷)

کائنات کی ہر شئے خدا کا سجدہ کرتی ہے اور عاشق کو اس کا سجدہ کرنا نظر آتا ہے:۔

دید ملالی عیان بر ورق کائنات — جملہ ذرات کون پیش رخش در سجود (غزل ۱۸)

خدا کی جناب تک رسائی کے لیے دل کو غیر کی یاد سے پاک کرنا ضروری ہے:۔

تا چون در خور یادش نبای رو نوحہ کن بر خود — کسی را شاید این کو دل بغیر او نیالاید (غزل ۱۹)

بغیر مرشد کی نظر کرم کے کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا اس لیے مرشد کا ادب لازم ہے :-

چون سرِ نوشوی انگشت نما در همه جا ــــ پشت هر کس که ببوسیدن پای تو خمید

شده از طالع فرخنده سرافراز جهان ــــ آنکه از صدق و لدادت برکاب تو دوید

به علی یک نظر لطف کن از راه کرم ــــ که بجایی نرسد بی نظر پیر، مرید (غزل ۲۰)

گرفتار خودی خدا کو نہیں پا سکتا :-

هر که بیرون ز خود اندر طلبت سعی نکرد ــــ از پی آب چو ماهی بهمه عمر تپید (غزل ۲۱)

عاشق کو ہر وقت مراقب رہنا چاہیے کہ دل میں غیر کا خطرہ نہ آنے پائے :-

از کنار خویش می یابم دمادم بوی یار ــــ زان همی گیرم بهر دم خویشتن را در کنار (غزل ۲۲)

سوز و گداز قلب کے بغیر طاعت بے قدر ہے :-

طاعت و زهد ریائی را برین در قدر نیست ــــ تحفه ای آنجا نیارد کس بجز سوز و گداز (غزل ۲۳)

وجود میں فرق نہیں ہے (یعنی ظہور اشیاء میں فرق ہے نہ کہ اصل وجود میں)

بتفاوت مبین که اصل وجود ــــ نشود مختلف بهیچ نسق (غزل ۲۴)

عاشق جنت کے لالچ میں نہیں عبادت کرتے :-

ای گرفتاران عشقت فارغ از مال و منال ــــ والهانِ حضرتت را از خود و جنت ملال (غزل ۲۵)

پیر کی ایک نظر کرم سے مقصد کونین حاصل ہو سکتا ہے :

در گاهِ جود را چه زیان کرده میشود ــــ کار دو کون اگر کنی در یک نظر تمام (غزل ۲۶)

فنا کے بعد وحدت وجود کا شعور ہوتا ہے :-

معذ گاریست که هم طالب و هم مطلوبم ــــ طرفه حالیست که هم درد و هم درمانم

تا شدم محو علی پادشه ملک فنا ــــ اسپ همت بسوی ملک بقا میدانم (غزل ۲۷)

عشق، عاشق اور معشوق سب ایک ہیں :-

عشق جانان آتش و جانِ علالی خس بود ــــ خس چو در آتش فنا شد دیگرا ورا خس مخوان (غزل ۲۸)

کبھی کبھی اپنے کو صاحب کمال تصور نہ کرو :-

از من مجوی راهی چون رام نیست بختم ــــ کی راه داند آن کو گم گشته خویش حیران (غزل ۲۹)

خدا کی یاد سے ایک لمحہ بھی غفلت موجب خسران ہے :-

هر دم که بی غم او از سرّ دل بر آید ــــ آن دم ز راه غیرت بر جان مات تاوان (غزل ۳۰)

شریعت کی پابندی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا :-

بی امتثالِ امرش چشم امید مگشای ــــ مرد آن بود که دارد بر دیده مُهر فرمان (غزل ۳۱)

انا قفل ہے اور عجز اس کی کلید۔ نیاز کے ذریعہ ہی ناز کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے :-

قفل این در شد علالی و کلیدِ آن نیاز ــــ گر نیازی داری این جا بر سریر ناز شو (غزل ۳۲)

عاشقوں کا دل تجلی گاہ ربانی ہے :-

چون مسند جلالش دلهای بیدلانست ــــ پس شاهباز حسنش این جا بود همیشه (غزل ۳۳)

تکبر چھوڑ دو تو تمہیں یقین کی دولت حاصل ہو گی :-

اساسِ خود چو بدانی تکبری بگذار ــــ ز کارخانهٔ عزت یقین ثمر یابی (غزل ۳۴)

معشوق کے رتبہ کے آگے تحفۂ جان بھی ہیچ ہے :-

صد جان علی به هر دم کردی نثار راهش ــــ گر نه علالتش را زین تحفه عار بودی (غزل ۳۵)

عاشق کا شیوہ تسلیم و رضا ہے :-

هر که سرگشتهٔ چوگان غمت گشت چو گوی ــــ سر چو چوگان نهد اندر سر کویت روزی (غزل ۳۷)

فرشتے بھی عاشقانِ الٰہی پر رشک کرتے ہیں :-

روحانیان علوی در رشک وحسرت افتند چون بیدلی نشیند با یاد تو زمانی (غزل ۳۸)

سالک کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہے :-

علائیا گر ازین حال جبرتست ترا امید قطع مکن چون بوقت مرہونی (غزل ۳۹)

عشق کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے :-

لاف عشقش مزن امروز علائی تربان چون یقین از پس امروز بود فردایی (غزل ۴۰)

حرص وحسد کے ساتھ وصل یار ممکن نہیں :-

گُلی از گلشن وصلی فتادہ اندر خاک میان گلخن حرص وحسد چہ می بو لی (غزل ۴۱)

ذخیرۃ الملوک کے علاوہ راقم کی نظر سے حضرت سید علی ہمدانی کی جو کتابیں اور رسائل گذرے ہیں جس کی بنیاد پر حضرت سید علی ہمدانی کے تصوف وسلوک کا یہاں مختصر ذکر کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے :-

رسالۂ فتوتیہ ، رسالۂ درویشیہ ، رسالۂ ذکریہ ، چہل اسرار ، مشارق الاذواق اور رباعیات ۔ ان تمام رسالوں کو ایڈٹ کرکے اور ایک مقدمہ کا اضافہ کرکے ڈاکٹر محمد ریاض نے اسے ایک مجلد میں بنام احوال وآثار واشعار میر سید علی ہمدانی ، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان سے ۱۹۸۵ میلادی میں شایع کیا ۔ یہی کتاب راقم کے پیش نظر ہے اور صفحات کے حوالے اسی کتاب سے دیئے گئے ہیں :-

جملہ کتابیات کی فہرست

۱- احوال وآثار میر سید علی ہمدانی (با شش رسالہ از وی) بکوشش ڈاکٹر محمد ریاض۔ مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان ، ۱۹۸۵ء

۲- مناہج الطالبین ومسالک الصادقین تالیف نجم الدین محمود بن سعد اللہ اصفہانی باہتمام نجیب مایل ہروی با ہمکاری سید عارف نوشاہی انتشارات مولیٰ چاپ اول ۱۴۰۵ھ ق

۳- لطایف اشرفی (خطی)

۴- مکتوبات اشرفی (خطی)

۵- حیات سید اشرف جہانگیر از سید وحید اشرف مطبوعہ ۱۹۷۵

۶- ذخیرۃ الملوک

۷- شرح احوال وافکار وآثار شیخ علاء الدولہ سمنانی تالیف سید مظفر صدر چاپ تہران

۸- معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۶۶ء ۔

سینما ہے یا صنعتِ آذری ہے؟

(اقبالؔ کی نظم "سینما" قرآن اور احادیث کی روشنی میں)

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پٹنہ

(۲)

۶۔ سینما کو "صنعت آذری" اور "شیوہ کافری" قرار دیئے جانے کا ایک پہلو تو تصاویر سے متعلق ہے جس کا بالتفصیل ذکر اوپر آچکا۔ اب اس تصویر سے متعلق وہ فتنے ہیں جو فلموں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ ہے بے حجابانہ بوس وکنار، بے محابا اختلاط اور ہم بستری، کمر اور کولھے کی جنبش، اعضائے صنفی کا ننگا اظہار حتی کہ وہ مناظر بھی جن کا ذکر کر کے "بتوں کی گندگی" نے معارف جیسے رسالے کو ناپاک کرنا نہیں ہے۔ ان سب کا تعلق فحاشی اور بے شرمی و بے حیائی سے ہے اور اقبال جب اس پوری صنعت کو "شیوہ کافری" کہتے ہیں تو ان کے ذہن میں وہ سارے قرآنی احکام بھی ہیں جو فحاشی اور بے شرمی و بے حیائی سے دور رہنے کے لیے قرآن میں وارد ہوئے ہیں جن کا ذکر آگے کیا جا رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ نے ایسے تو پورے قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے مختلف مواقع پر "محرمات" کی بالتصریح وضاحت کی ہے مگر ایک موقع پر سورۂ انعام کے رکوع ۱۹ میں دس

پابندیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسانی زندگی اور معاشرہ کو منضبط کرنے کے لیے عائد کی گئی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائع الٰہیہ کی اصل الاصول رہی ہیں۔ جن میں ایک پابندی فحاشی سے بچنا بھی ہے۔ پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ:

"اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں" اس کے بعد پانچ پابندیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

"اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی"

یہ پانچ پابندیاں سنا دینے کے بعد فرمایا گیا: "یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو"۔ اس کے بعد پھر پانچ پابندیاں اسی سلسلہ میں سنائی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے:-

"نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو"

ان آخری فقروں میں یہ صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستہ پر زندگی بسر کرے۔ اس کے قبول نہ کرنے کے دو بڑے نقصانات ہیں۔ ایک یہ کہ ہر دوسرے راستہ کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے، دوسرے یہ کہ اس راستے سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں جن میں بھٹک کر پوری نوع انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بلوغ و ارتقاء کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا کے راستے پر چلنے سے منھ موڑ لینا اور خود سری

وخود مختاری اختیار کر لینا کفر کی روش اختیار کرکے "سواء السبیل" گم کر دینا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کر دی۔" (سورۃ المائدۃ۔ رکوع ۳)

فحاشی سے متعلق سورۃ النحل کی آیت ۹۰ (جسے ہم ساری زندگی جمعہ کے خطبہ میں سنتے ہیں) درج ذیل ہے:۔

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔"

اس آیت میں پہلے تین بھلائیاں عدل، احسان اور صلہ رحمی کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کے مقابلے میں تین برائیاں بدی، بے حیائی اور ظلم و زیادتی کا ذکر آیا ہے۔ بے حیائی (فحشاء) کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے یعنی وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہے جس میں برہنگی، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے، ڈرامے اور فلمیں، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ سب شامل ہے۔

۷۔ سینما سے متعلق "شیوۂ کافری" کے مختلف پہلوؤں کو گرفت میں لانے کے لیے فحاشی پر قرآنی احکام ذہن نشین ہو چکنے کے بعد اب شرم و حیا کے متعلق ہدایات سامنے رکھیے۔ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ یہ شرم قرآن کی رو سے، انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے، اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔

شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی یہ تھی کہ اس نے اس جذبۂ شرم و حیا پر ضرب لگائی اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کے دروازے کھول دیئے۔ یعنی اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کے لیے تلاش کیا، وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اس محافظ فصیل پر لگائی جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی اور شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ روش آج سینما میں بھی نظر آتی ہے، جہاں مہذب و متمدن کہلانے کے لیے عریانیت اولین منزل ہے۔ ابلیس نے حضرت آدمؑ کو جب سجدہ کرنے سے انکار کیا تو خدا نے ابلیس سے فرمایا:۔

"نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا" (سورۃ الاعراف۔ رکوع ۲)

اور حضرت آدمؑ کو ہدایت کی کہ:۔

"اور اے آدمؑ، تو اور تیری بیوی دونوں اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے کھاؤ۔ مگر اس درخت کے پاس نہ بھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

سورۃ الاعراف۔ رکوع ۲)

چونکہ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اسے الٹا پستی کی طرف لے جائے اس لیے اسی رکوع میں آگے

مذکور ہے کہ :-

"پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا: تمھارے رب نے تمھیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے" اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکہ دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انھیں پکارا "کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟" دونوں بول اٹھے: "اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔" فرمایا "اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمھارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے" اور فرمایا: "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا" (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲)

شرم و حیا ہی کے متعلق دوسرے موقعوں پر فرمایا گیا :-

"اور اے نبیؐ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔" (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۴)

"نبیؐ کی بیویو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو" (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۴)

ایک طرف خدا کا یہ حکم کہ "اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں" اور دوسری طرف "بیلے ڈانس" اور "راک اینڈ رول" جو سب سے متمدن رقص سمجھا جا رہا ہے۔ ان کا اطلاق اقبال کی نظم "سینما" میں "شیوۂ کافری" کو سمجھنے کے لیے کیجیے۔ اور فلموں کے ناچ کو سامنے لائیے جو آئے دن اسکرین پر دکھائے جاتے ہیں۔ اقبال کی نظم "رقص" بھی پڑھتے چلیے تاکہ "شیوۂ کافری" اور بھی واضح ہو جائے :-

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی!

صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اس رقص کا، درویشی و شاہنشاہی!

(ضربِ کلیم)

۸۔ شرم و حیا کا تعلق لباس سے بھی ہے۔ قرآن مجید میں قصہ آدمؑ و حوّا کے ایک خاص پہلو لباس کی طرف توجہ منعطف کر کے اسی سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۳ میں فرمایا گیا:-

"اے اولاد آدمؑ، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللّٰہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم، ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے

ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے"

ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی بلکہ شرم و حیا کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا۔ اس نے انسان کے لیے اس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی نہیں بنایا بلکہ "سوأۃ" بھی بنایا یعنی جن کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ اور پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے انسان کو کوئی بنا بنایا لباس ہی نہیں دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا)۔ جب انسان نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر الٹ گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمھارے لیے لباس کی ضرورت بعینہ اسی طرح ہے جو حیوانات کے لیے "ریش" کی ضرورت ہے۔ رہا اس کا "سوأۃ" کو چھپانے والی چیز ہونا تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضاء "سوأۃ" نہیں ہیں اسی طرح تمھارے یہ اعضاء بھی "سوأۃ" نہیں۔ محض اعضاء صنفی ہی ہیں۔

ان آیات میں سب سے اہم اور قابل توجہ فقرہ یہ ہے کہ "اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے" تقویٰ کے لباس سے مراد وہ لباس ہے جو پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر ان ذہنی امراض کی نمایندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔

اب لباس پر ان قرآنی آیات کے پیش نظر فلموں میں عریانیت اور ننگے پن کا تصور

کیجیے اور پھر اقبال کے اس قول پر غور کیجیے کہ سینما کی صنعت "صنعتِ آذری" اور "شیوۂ کافری" ہے یا نہیں۔

۹۔ اقبال نے نظم "سینما" میں سینما کی صنعت کو "شیوۂ ساحری" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس ساحری کو اگر قرآن کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اقبال کو اس نظم میں کن قرآنی تصورات کا اظہار مقصود ہے وہ بات بہتر طور پر سمجھ میں آتی ہے۔

جادو محض نظر اور نفس کو متاثر کر کے اشیاء میں ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کراتا ہے اور یہی فعل فرعون کے جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت کو رد کرنے کے لیے کیا تھا اور اپنے جادو سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھایا تھا۔ مگر جادو اور خدائی نشان اور حق کا فرق تب ظاہر ہوا جب حضرت موسیٰؑ کے عصا نے سانپ بن کر اس طلسم و فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو فرعون کے جادوگروں نے تیار کیا تھا۔ یعنی یہ سانپ جدھر جدھر گیا جادو کا اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسی، رسی بن کر رہ گئی اور نتیجۃً:۔

"اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانی مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گئے اور جادوگروں کا یہ حال ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: "ہم نے مان لیا رب العالمین کو، اس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں" (سورۃ الاعراف۔ رکوع ۱۴)

خدائے تعالےٰ نے قرآن میں اس قصہ کی تفصیل بیان فرما کر جادو کی یہ اصل ذہن نشین

کرایا ہے کہ جادوگر کس سیرت اور اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کیا کرتے ہیں اور اس قصہ کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ

"اور جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے (وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ)" (سورۃ یونس۔ رکوع ۸)

ساحری کا دوسرا قصہ قرآن میں سامری کا ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کے غائبانہ میں (جب آپؑ چالیس دنوں کے لیے خدا کے بلانے پر کوہِ سینا پر تشریف لے گئے تھے) زبردست مکرو فریب کی اسکیم تیار کی اور ایک سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کردی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال کر اس کی پرستش کرانے لگا۔ اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گڑھ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ مگر کوہِ سینا سے لوٹنے کے بعد ساحری کے اس قصہ کو سنتے ہی حضرت موسیٰؑ نے سامری سے فرمایا کہ:۔

"اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا" (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۵)

اس ساحری کا حشر یہ ہوا کہ زندگی بھر کے لیے دنیا میں معاشرے سے سامری کے تعلقات توڑ دیئے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا جبکہ آخرت کی باز پرس الگ رہی۔

اقبال کے فکری نظام میں "شیوۂ کافری" اور "شیوۂ ساحری" کے تباہ کن اثرات، جنھوں نے مسلمانوں کی روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کر رکھا تھا، سوہانِ روح بنے رہے، چنانچہ نظم "سینما" کے پہلے دونوں اشعار کی تلخیص اقبال کے اس شعر میں بھی ملتی ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا — میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری

(بانگِ درا: "میں اور تو" (بعد از نظم "شیکسپیئر")

۱۰۔ اقبال نے نظم "سینما" میں سینما کو "تہذیب حاضر کی سوداگری" سے بھی موسوم کیا ہے۔ وہ اس نظم کے پہلے ہی شعر میں یہ کہہ چکے ہیں کہ "یہ صنعت آذری ہے"۔ صنعت سے مراد چیزوں کا بنانا، انھیں فروخت کرنا اور ان سے مادی فائدے حاصل کرنا ہے جسے عرفِ عام میں انڈسٹری یا بزنس کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد آذر بت بنانے اور بیچنے کا کاروبار کرتے تھے اسلیے اقبال نے "شیوۂ کافری" کا نام ہی "آذری" رکھ دیا یعنی بت گری ہی نہیں بلکہ بت فروشی بھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی ساری جنگ اپنے والد اپنی قوم اور اپنے وقت کے حکمراں سے اسی "شیوۂ کافری" کے خلاف تھی۔ آپؑ کے قبل اور بعد میں اور آج تک بت فروشی دنیا کے بہت بڑے حصہ میں ایک صنعت رہی ہے اور آج بھی ہے جس سے مادی فائدے حاصل کیے جاتے ہیں۔ مگر اقبال کہتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کرتے تھے اور آج بھی ایسا کرتے ہیں تو اس کے پیچھے ان کا ایک دینی اعتقاد بھی ان بتوں سے وابستہ ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روزِ ازل سے ہی لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن کا اصول کارفرما ہے اور تا قیامت رہے گا۔ مگر "تہذیب حاضر" نے اسی صنعت کو "سینما" میں فنِ لطیف کے طور پر نہیں بلکہ عام بزنس و انڈسٹری بنا دیا جہاں علی الاعلان بے شرمی، بے حیائی، ننگاپن اور اعضائے صنفی کی نمائش کو بیچا اور خریدا جاسکتا ہے اور جس سے اس انڈسٹری میں لگے دونوں اپنی دنیوی زندگی کا "بیلنس شیٹ" اور "پرافٹ اینڈ لاس اکاؤنٹ" تیار کرتے ہیں۔

تہذیبِ حاضر کی اس "سوداگری" کا مظاہرہ ہم آئے دن اسکرین پر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاؤڈر اور صابن کا ایک منٹ کا اشتہار اسکرین پر دکھانے کے لیے عورتوں کو اپنے جسم کے سارے حصوں (جن میں ان کی شرمگاہیں اور سارے صنفی اعضا شامل ہیں) دس بیس ہزار کی رقم ادا کی جاتی ہے۔ اسی طرح فلموں میں

فحش اور عریاں تصاویر، خلط ملط اور ہم بستری دکھلانے کے لیے اداکاروں کو بہت بھاری رقم دی جاتی ہے کیونکہ ہر اداکارہ اس فحاشی کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اس "سوداگری" کو "تہذیب حاضر" نے متمدن اور مہذب معاشرہ کا معیار قرار دیے جانے کیلئے اس پر قانونی مہر بھی لگادی ہے۔ اس صنعت میں "شیوۂ ساحری" کس طرح کار فرما ہے اسے یوں سمجھیے کہ فحش فلموں میں قبل فلم اسکرین کیے جانے کے "بورڈ آف فلم سنسرس" کا یہ سرٹیفیکٹ اور ہدایت اسکرین پر دکھلایا جاتا ہے کہ اس فلم کو اٹھارہ سال کی عمر سے کم کے لوگ نہ دیکھیں اور فلموں کو اسکرین کرنے کی اجازت "A" یعنی Adult یا "U" یعنی "universal" کی شرط پر ہی دی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر فلموں کا مقصد معاشرہ کی اصلاح اور تعلیمی پہلو بھی ہے تو کسی فلم کو دیکھنے کے لیے عمر کی قید کیوں لگادی جاتی ہے خصوصاً اس عمر کے لوگوں پر جو ملک کے آئندہ ہونہار سپوت بننے والے ہیں۔ اقبالؔ نے انہی دور رس اثرات کے تحت اس صنعت کو "تہذیب حاضر کی سوداگری" کا نام دیا ہے۔

۱۱۔ اب آخر میں نظم "سینما" کے آخری اور کلیدی شعر پر آیئے جس میں اقبالؔ نے اس صنعت کو "بت خانہ خاکستری" سے تعبیر کیا ہے جس کا خمیر "آذری" اور "کافری" سے تیار کیا گیا ہے۔ اگر اقبالؔ کہتے ہیں کہ پرستش کیے جانے والے بت تو مٹی سے بنائے جاتے ہیں اور دنیا ہی کے بت خانہ میں رکھے جاتے ہیں مگر سینما کی صنعت تو دوزخ کی مٹی سے تیار کی جاتی ہے اور اس کا بت خانہ جہنم میں بنتا ہے تو وہ اس صنعت میں لگے لوگوں اور اس کی فلموں کو دیکھنے والے مسلمانوں کو اس انجام سے آگاہ کرتے ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان نہ رکھ کر "شیوۂ کافری" میں ملوث ہونے کا نتیجہ ہوگا۔ وہ یہ کہ:۔

"اللہ اور اس کے رسول پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی

آگ مہیا کر رکھی ہے" (سورۃ الفتح۔ رکوع ۲)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے" (سورۃ یونس۔ رکوع ۱)

"ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوٹ دے دیتے ہیں ..... حد سے گذر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیے گئے ہیں، لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انھوں نے ایمان لا کر ہی نہیں دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو" (سورۃ یونس۔ رکوع ۲)

۱۲۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اقبالؔ کی نظم "سینما" کے تجزیہ کے بعد نفس مضمون کو ملحوظ رکھ کر چند بنیادی باتوں کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ فحاشی، بے شرمی اور بے حیائی پر اللہ اور رسولؐ کی ان صاف صاف ہدایتوں کو جان لینے کے بعد ایک مومن انسان کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی، اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو ان اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سدباب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسولؐ نے سنت میں اس قدر تفصیلی احکام دیئے ہیں یا پھر اگر وہ اپنے نفس کی کمزوری کے باعث ان کی یا ان میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ ماننے اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے گناہ کو ثواب بنا کر "تازہ شریعت" ایجاد نہ کرے۔ اور جب

رسول اللہؐ دعوت حق میں مصروف تھے تو جیسا منکرین اور کافرین کہا کرتے تھے وہ یہ نہ کہے کہ :۔

"اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔" (سورۂ یونس۔ رکوع ۲)

اکبر الہ آبادی بھی مسلمانوں کو یہی کچھ کہتے رہے مگر مسلمانوں کے "شیوۂ کافری" نے انھیں بھی مایوس کرکے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ؎

نہ حالی کی مناجاتوں کی کی پروا زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

تو اقبال بھی یہ کہہ کر گزر گئے کہ ؎

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

(بانگ درا: "قطعہ")

اقبال کامل

(دار المصنفین کے سلسلۂ ادبی کتب کی ایک اہم کتاب)

اس کتاب کی تصنیف سے پہلے اگرچہ ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی جا چکی تھیں، ان میں یوسف حسین خاں کی روح اقبال بھی ہے۔ جسکو اسوقت تک اقبال پہ حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی انکی مافوق العادۃ شخصیت پر اظہار خیال کے لیے ایک کتاب کی سخت ضرورت تھی جس کو علامہ شبلیؒ کے ادبی جانشین مولانا عبد السلام ندوی صاحب شعر الہند نے توقع کے عین مطابق پورا کیا ہے، اس میں علامہ اقبال کے مفصل سوانح حیات انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان کی شاعری کے اہم موضوعات فلسفۂ خودی، بیخودی، نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے

قیمت :۔ ۴۰ روپیے۔ صفحات :۔ ۴۰۰

اخبار علمیہ

عربی زبان میں تحقیق و تالیف کا معیار خوب سے خوب تر ہوتا جاتا ہے مذہبی علوم کے علاوہ عصری علوم و فنون میں بھی مفید کتابیں چھپ رہی ہیں، ایسی ہی ایک کتاب "التقنیہ عند المسلمین" (اسلامک ٹکنولوجی) ہے جو یونسکو اور کیمبرج یونیورسٹی پریس کے تعاون سے شایع ہوئی ہے، اس میں عربی، فارسی اور ترکی ماخذ کی مدد سے پہلی صدی ہجری سے قرون وسطیٰ کے عہد آخر تک مسلمانوں کی تکنیکی صلاحیتوں کا سیر حاصل علمی جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب ۳۰۰ صفحات کی ہے اور اس کے مولفین احمد الحسن اور ڈونالڈ ہیل ہیں۔

ایک اور کتاب "اسرار الفضاء" کے نام سے شایع ہوئی ہے جو خلا میں ہونے والی سائنسی سرگرمیوں کے موضوع پر ہے، اس میں جدید ترین دریافتوں کو مستند علمی انداز میں جمع کیا گیا ہے۔ ۴۰۰ صفحوں پر مشتمل اس کتاب میں چالیس سائنسی امور کے متعلق معلومات درج ہیں۔ کتاب کے مولف مہندس سعد شعبان ہیں۔

مصر کی ایک خبر یہ بھی ہے کہ وہاں کے اسلامی امور کی مجلس اعلیٰ کے سب سے بڑے ہال کو مرحوم ضیاء الحق سابق صدر پاکستان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، اس کے علاوہ مصر کی ایک جدید ترین اور نہایت شاندار مسجد کا نام بھی ان کے نام پر رکھا گیا ہے ع صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

---

۸۰ سالہ اسٹیفن اسپنڈر، انگریزی زبان کے ممتاز ترین شاعر و نقاد ہیں، انھوں نے ٹی، ایس ایلیٹ سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ حال ہی میں ایک انٹرنیشنل پوئٹری فیسٹیول میں شرکت کے لیے وہ ہندوستان آئے تو انھوں نے ہندوستانی مصنفین کی انگریزی تحریروں کے متعلق کہا کہ ان کے بڑے حصہ کی زبان، دقیانوسی، فرسودہ اور متروک ہے، ہندوستان میں

انگریزی تحریر و تصنیف کا رواج انیسویں صدی سے ہوا اور اب یہاں انگریزی میں بھی اتنا ہی لکھا جانے لگا ہے جتنا کسی دوسری ملکی زبان میں لکھا جاتا ہے مگر بقول مسٹر اسٹیفن "یہ لوگ انگریزی زبان کے بدلتے ہوئے رجحانات سے بے خبر ہیں، اکثر لکھنے والے قواعد صرف و نحو کے اسیر ہیں، البتہ ٹیگور کو برطانیہ میں بڑی قدر و منزلت حاصل ہے"۔

دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں شاعری اور جدید معاشرہ میں اس کی اہمیت پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا اس میں مختلف ممالک کے بیس سے زیادہ نمایندوں نے حصہ لیا اور شاعری کے متعلق مختلف و متضاد خیالات ظاہر کیے مثلاً "اب معاشرہ میں شاعری کا کوئی عمل دخل نہیں رہا" "زندگی اور سماج میں شاعری کی اہمیت اور کردار سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا" "زندگی کے دوسرے پر لطف مشاغل کی طرح یہ بھی بس ایک ذریعۂ تفریح ہے" "یہ محض تفریح نہیں کم از کم ہندوستان میں شاعر کی حیثیت نوائے سروش اور لسان عصر کی ہے" "اور اگر یہ سودائے جنوں ہے تو اس میں جان کے ضیاع کا بھی اندیشہ ہے" "صداقت کو دوام بخشنے میں شاعری کا کردار سب سے موثر ہے" "شاعر کا کام افکار سازی نہیں بلکہ افکار کی ترجمانی ہے" "شاعروں کی طرح شاعری بھی متنوع ہے" "شعری فن پارہ کا ظہور جتنا پیچیدہ ہے اتنا ہی سہل بھی ہے" "اصل شاعری وہی ہے جو مبنی بر حقیقت ہو" غرض فی کل وادٍ یہیمون؛ تعجب ہے کہ قومی پریس نے اس سیمینار کی رپورٹ میں کسی اردو شاعر کا ذکر نہیں کیا۔

دہلی میں شعر و شاعری کے متعلق ان خیال آرائیوں کے بعد لندن کی یہ خبر بھی پڑھیے کہ وہاں کے سائنسدانوں نے ایک ایسی الیکٹرونی شعاع ایجاد کی ہے جس کے ذریعہ حرفوں کو اس درجہ مختصر کیا جا سکتا ہے کہ پوری انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ایک سوئی کے ناکہ پر لکھی جا سکتی ہے،

لیورپول یونیورسٹی میں یہ الیکٹرونی خوردبین موجود ہے جس کے ذریعہ ایک انتہائی طاقتور شعاع (لیزر بیم) کے ذریعہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ میں لاکھوں باریک ترین سوراخ کیے جا سکتے ہیں۔

وینس یا سیارہ زہرہ، قدیم زمانہ سے حسن و محبت کا مظہر سمجھا جاتا ہے، لیکن ابھی تک اسکے حقائق مخفی و سربستہ تھے، وجہ یہ تھی کہ اس سیارہ کے چاروں طرف بادلوں کے اتنے کثیف پردے تھے کہ ان تک رسائی آسان نہیں تھی تاہم انسان ان کے تجسس میں لگا رہا۔

۱۰ برس پہلے امریکی سائنسدانوں نے پانیر ۱۲ نامی ایک سیارچہ زہرہ کی طرف روانہ کیا، ۱۰ سال کے عرصہ میں اس نے تقریباً ۱۰,۰۰۰ ملین چھوٹی بڑی تصویری اطلاعات فراہم کیں، ان کی مدد سے زہرہ کے رخ سے پہلی بار پردہ اٹھا، پہلے خیال تھا کہ کرہ ارض اور سیارہ زہرہ دونوں ضخامت و حجم میں برابر ہیں، لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ دونوں میں بڑا فرق ہے، اول تو زہرہ، فضا کی انتہائی کثافت کی وجہ سے بالکل جامد، خشک اور مردہ ہے، اس کا درجہ حرارت ۴۷۰ سینٹی گریڈ ہے جو پگھلتے ہوئے جست و سیسہ کی گرمی سے بھی زیادہ ہے، ممکن ہے ۳,۵۰۰ ملین سال پہلے یہ سمندروں سے لبریز رہا ہو لیکن اب ان سمندروں میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کی آکسیجن نے کاربن ڈائی آکسائڈ کی ایک عظیم مقدار کو خود میں جذب کر لیا ہے، سائنسدانوں نے تصاویر کی مدد سے اس سیارہ کا ۹۳ فیصد نقشہ بنایا ہے جس میں زمین کی طرح اونچے پہاڑ، وسیع میدان اور گہرے غار ہیں، وہاں کے آتش فشاں پہاڑ، دنیا کے آتش فشانوں سے کہیں زیادہ بڑے ہیں، زہرہ کی محوری گردش نہایت سست ہے، وہاں کا ایک دن ہماری دنیا کے ۸ مہینوں یا یعنی ۲۴۳ دنوں کے برابر ہے، اس کی سطح میں قوت کشش کا وجود نہیں ہے قوت جاذبہ رکھنے والی سطح کے لیے یہ ضروری ہے کہ کرہ میں اندرونی طور پر برقی رو پیدا کرنے والا

میکانکی نظام ہو، جس کے لیے ایک زبردست مرکز گریز طاقت (STRONG CENTRIFUGAL FORCE) ضروری ہے اور یہ تیز محوری گردش سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس سست رفتار گردش کے باوجود سیارہ زہرہ کا موسم ہر چار دنوں کے بعد بدل جاتا ہے، سائنسداں اس تبدیلی کے اسباب کو ابھی سمجھ نہیں سکے ہیں، فہم اور عجز فہم کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا، اقرار تو بس اس کا ہونا چاہیے کہ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ

ایک طرف تو انسان خلاؤں اور ستاروں کی تسخیر میں لگا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کا جذبۂ عبودیت اس قدر کمزور ہے کہ اس کی جبینِ نیاز کو کہیں قرار نہیں، نیپال کے بتوں میں ایک نئے بت کی اطلاع ملی ہے، نیپال کے ایک پس ماندہ قبیلہ نیوار میں ۳ سے ۹ سال تک کی عمر کی ایسی بچی کا انتخاب کیا جاتا ہے جو شکل و صورت کی اچھی، صحت مند اور متناسب الاعضاء ہو، اس کو کاٹھمنڈو کے ہنومان ڈھوکا مندر میں لایا جاتا ہے اور سن بلوغ تک بادشاہ اور رعایا اس کی پرستش کرتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد وہ خدائی خلعت سے محروم کر دی جاتی ہے، جس کے بعد اس دیوی کی محرومیاں شروع ہو جاتی ہیں، اس وہم کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہوتی کہ شادی کرنے والا جلد ہی مر جاتا ہے، حکومت اب ایسی دیویوں کے لیے وظیفہ کی سہولت فراہم کر رہی ہے، وظیفہ یاب خدا کا تصور اس ترقی یافتہ دور میں انسان کے تصور و خیال کی بلندی کا نتیجہ ہے یا پستی کا؟

اسی ضمن میں کمبھ کے میلہ میں ایک برہنہ اور عریاں بدن ناگا سادھو کا یہ فلسفہ عریانیت ملاحظہ ہو کہ "عریانیت، انسانی زندگی کی دوئی اور ثنویت کا خاتمہ ہے، حقیقت کائنات میں دورنگی نہیں، مادی جسم کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، جسم کی فکر، روح کی اذیت کا سبب ہے، ظواہر کے فریب سے کامل قطع تعلق کے بعد ہی دنیا کی آلائشوں سے نجات حاصل ہوتی ہے"

ع۔ص

معارف کی ڈاک

(۱)

مکتوب ڈربن

۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء

برادر مکرم اصلاحی صاحب حیاکم اللہ تعالیٰ بالصحۃ والعافیۃ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، بڑے عرصہ سے آپ کو خط لکھنا چاہ رہا تھا، مگر نوبت نہ آئی، حقیقی عذر خط پہلے نہ لکھنے کا یہ ہے کہ میرے لیے دونوں ہی سال ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء غم و حزن کا سال ہے، جولائی ۱۹۸۷ء میں والدہ کا انتقال ہوا، اور پھر اسی سال نومبر میں صباح الدین صاحب کا حادثہ پیش آیا، والد مرحوم کا انتقال بھی نومبر میں ہوا تھا، اس لیے نومبر اور خصوصاً ۲۲ نومبر مجھے یوں بھی افسردہ کر دیتا ہے، ۱۹۸۸ء میں ہی میری سب سے چھوٹی بہن جن کو ہم سب قریبی اعزہ تارہ کے عرفی نام سے جانتے ہیں، اور عرصہ سے بیوہ تھی، کینسر میں مبتلا ہوئی، والدہ کے انتقال کے بعد مرض میں شدت ہو گئی، اور بالآخر ۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو وہ بھی چل بسی، غرض ان حوادث کے تسلسل نے نفسیاتی طور پر صوفیہ کی اصطلاح میں شدید قبض کی کیفیت میں مبتلا کر دیا، اور اس کیفیت سے نکلتے نکلتے مجھے دو سال لگ گئے، اس عرصہ میں قلم پکڑنے سے طبیعت میں وحشت ہوتی تھی، اسی لیے صباح الدین صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو خط نہ لکھ سکا، البتہ دل کی آواز استاذ مکرم مولانا علی میاں تک پہونچا دی تھی، اور انھوں نے جواباً آپ کے اور شہاب بھائی کے تقرر کی اطلاع فرمائی تھی۔

والد مرحوم جس زمانے میں طویل قیام کے لیے بھوپال چلے گئے تھے تو اکثر اپنے احباب کو غالب کا یہ شعر لکھ دیا کرتے تھے ؎

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں، کیجیے ہائے ہائے کیوں

دنیا کا کام تو بند نہیں ہوتا مگر ایسے اشخاص جو کسی ادارہ سے طویل زمانہ تک متعلق رہے ہوں، جب داغِ مفارقت دے جاتے ہیں تو نقصان تو یقیناً ہوتا ہے، اور کبھی کبھی تلافی بھی مشکل ہوتی ہے، مگر ٹیم ورک (Team work) کے اصول پر کوئی نہ کوئی ابھر کر سامنے آجاتا ہے، جو اس کام کو آگے پہونچاتا ہے، اب دار المصنفین کی علمی سربراہی آپ جیسے اہل کے ہاتھ آئی ہے، الحمد للہ آپ اسکے اہل ہیں، اور چونکہ دار المصنفین کی تاریخ و مقاصد سے واقف ہیں اس لیے مجھے شبہ نہیں کہ دار المصنفین آپ کی قیادت میں یوں ہی بدستور ترقی کرتا رہے گا ان شاء اللہ، شہاب بھائی کی انتظامی صلاحیت تو ضرب المثل ہے، ان کو بمبئی کے صابو صدیق کا تجربہ ہے، اس لیے ان شاء اللہ آپ کی اور ان کی رفاقت ایک دوسرے کے لیے اور خود دار المصنفین کے لیے بہت قیمتی ہوگی، اللہ تعالیٰ یہ رفاقت طویل رکھے، اور آپ دونوں کے مساعی میں برکت عطا فرمائے۔

معارف برابر آرہا ہے، الحمد للہ آپ نے اس مجلہ کا علمی وقار و معیار قائم رکھا ہے، اور ان شاء اللہ یہ معیار اور بھی اونچا ہوگا، والد مرحوم نے جب معارف کے ٹائٹل کور پر اپنے بجائے شاہ صاحب مرحوم کا نام بحیثیت مرتب کے لکھوایا تھا تو چند ہی شذرات کے بعد بھوپال سے اور پھر کراچی سے بھی شاہ صاحب کو لکھا تھا معارف کے معیار میں اور مضامین کے رکھ رکھاؤ میں "س" اور "ش" کا فرق معلوم نہیں ہوتا، یہی میں آپ کو لکھ رہا ہوں کہ صباح الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد جب سے آپ نے ادارت سنبھالی ہے، اس کے شذرات و مضامین میں "ص" اور "ض" کا فرق معلوم نہیں ہوتا، اللّٰھم زد فزد، ہر شخص کی اپنی انفرادیت و خصوصیت کی چھاپ ہوتی ہے،

صباح الدین صاحب کی اپنی انفرادیت و خصوصیت تحریر میں تھی اور آپ کی اپنی ہے، مگر مجموعی طور پر آپ نے جس طرح دار المصنفین کی علمی قیادت کامیاب طور پر سنبھالی ہے، وہ ادارہ کے تابناک مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

ملفوف کارڈ میرے نام آیا تھا[1] معلوم نہیں مخاطب میں ہی تھا یا کوئی اور؟ کارڈ میں رسالہ تدبر کا ذکر ہے، میرے مجلہ کا نام العلم ہے، اور انگریزی میں ہے، وہ سالنامہ ہے اور برابر آپ کے یہاں جاتا ہے، تازہ شمارہ پریس میں ہے، اپریل تک آپ کو ملے گا، یہ کارڈ بھی آپ کے نام خط لکھنے کی تقریب بن گیا، کارڈ پر پتہ میرا ہے مگر مضمون کسی اور سے متعلق ہے، اسی لیے یہ کارڈ واپس بھیج رہا ہوں۔

مولانا ابو العرفان صاحب کے انتقال کا حادثہ بھی تکلیف دہ ہے، مجھے امید تھی، اور خیال تھا کہ مولانا ابو العرفان صاحب آپ کے لیے دار المصنفین کے معاملات میں خاصے مدد معاون ثابت ہوں گے، اب دوسری نسل کے افراد بھی جدا ہونے لگے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم کا سایہ قائم رکھے، تاکہ دار المصنفین و ندوہ پھلتا پھولتا رہے۔

مارچ ۱۹۸۸ء کے معارف میں آپ نے دار المصنفین کی نئی کتابوں کا ذکر کیا ہے، مجھے براہ کرم یہ تمام نئی کتابیں بھجوا دیجیے گا[2]، صباح الدین صاحب کی تصنیف جو والد مرحوم کی تصانیف پر ہے اس کی پہلی جلد تو بھیج ہی دیجیے، پھر جب دوسری جلد شائع ہو تب بھجوا دیجیے گا، سب سے بڑی خوشخبری تو آپ نے "شذرات سلیمانی" اور "مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مشاہیر کے خطوط" کی دی ہے، ان دونوں کے لیے میں شاہ صاحب مرحوم اور صباح الدین صاحب مرحوم دونوں کی

---

[1] اس خط پر خالد مسعود صاحب مدیر تدبر لاہور کے بجائے غلطی سے مکتوب نگار کا پتہ لکھ گیا تھا [2] افسوس ہے کہ یہ سب ابھی کتابت و طباعت ہی کے مرحلہ میں ہیں۔

ے اصرار کرتا رہا ہوں، الحمد للہ کہ یہ بڑا کام ہوا، شذرات سلیمانی کی جلدیں جیسے ہی شائع ہوں، براہ کرم مجھے فوراً بھجوادیں، معلوم نہیں شذرات پر تشریحی حاشیے بھی ہیں یا نہیں، کیونکہ تشریحی حاشیوں کے بغیر شذرات کا سیاق وسباق کبھی کبھی سمجھ میں نہ آئے گا، اسی طرح مشاہیر کے خطوط کا معاملہ ہے، معلوم نہیں کن مشاہیر کے نام شامل ہیں، میرے پاس کراچی میں تو ان خطوط کا مبیضہ موجود ہے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی خطوط ہیں، مولانا آزاد کے خطوط میں خاصی بے تکلفی ہے، اور بعض خطوط میں انھوں نے اپنے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں جن کی اشاعت والد مرحوم نے اپنی حیات ہی کے زمانے میں روک دی تھی، اب معلوم نہیں ان خطوط میں مولانا آزاد کے کون سے خطوط شامل ہیں، ان خطوط کو کیا صباح الدین صاحب نے مرتب کیا تھا؟ معلوم نہیں ان خطوط پہ بھی تشریحی حاشیے ہیں یا نہیں؛ حسب ذیل کتابیں بھی مجھے مطلوب ہیں: تذکرۃ المحدثین، تذکرۂ فقہائے اسلام[1]، سیرت عائشہ عربی کے سلسلہ میں بھی میری مراسلت وگفتگو استاذ مکرم مولانا علی میاں مدظلہ اور صباح الدین صاحب سے ہوئی تھی، میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ سیرت عائشہ کے حوالوں کی تصحیح واحادیث کے مآخذ کی نظر ثانی کے بعد جب مسودہ مکمل ہو جائے تو اس کی اشاعت دمشق یا جدہ سے ہو[2]، تاکہ اس کی نکاسی باہر آسانی سے ہو سکے، صباح الدین صاحب چاہتے تھے کہ دار المصنفین سے شائع ہو، مگر مجھے اس میں تامل تھا، اور ہے، حضرت مولانا علی میاں صاحب، دمشق وجدہ میں عربی نشر واشاعت کے اداروں سے واقف ہیں، بلکہ مجھ سے صلاح الدین مالک دار السعودیہ للنشر جدہ نے اس کی فرمائش بھی کی تھی، مولانا علی میاں مدظلہ بھی صلاح الدین صاحب کو جانتے ہیں، آپ بھی مولانا سے اس سلسلہ میں استفسار کر لیں، نفع اسی میں ہوگا اگر عرب ملک سے

---

[1] یہ دونوں بھی ابھی زیر طباعت ہیں۔ [2] تصحیح ونظر ثانی کا کام مکمل ہو گیا ہے، اور مولانا علی میاں اس کی طباعت کی فکر میں ہیں، اور یہ ان شاء اللہ عرب ملکوں ہی سے شائع ہوگی۔

طبع کرایا جائے، حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ سے اس پر مقدمہ ابھی سے لکھوا کر رکھ لیں، یہ خط خاصا طویل ہو گیا، ارادہ اس طوالت کا نہ تھا، دار المصنفین ہی کے واسطہ سے آپ سے تعلق ہے[1]، اور شبلی منزل کے ہر چپہ پر میرا بچپن اور لڑکپن گذرا ہے، اور اس کا ہر نقش میرے قلب وذہن پر ہے، دعا فرمائیے کہ مجھے وہاں آنے کا موقع ملے[2]، جواب کا انتظار رہے گا[3]، دوسرا خط شہاب دسنوی صاحب کو دے دیجیے، میں نے دار المصنفین کی جن کتابوں کا آرڈر دیا ہے، ان میں اسلام ومستشرقین کی جلد ۴ و ۵ کو بھی شامل کر لیجیے، پھر ان تمام کتابوں کا بل مجھے بھجوادیجیے تو رقم بھیج دی جائے گی، شکریہ! والسلام محتاج دعا: سید سلمان ندوی۔

---

(۲)

مکتوب مسقط

۲۹/۱۲/۸۸ء

محترم ومکرم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، چند دن گذرے آپ کا خط ملا تھا، امید ہے کہ میرا دوسرا خط بھی آپ کو مل چکا ہوگا۔

اس وقت حاضری کا سبب جناب محترم مولانا غلام محمد صاحب کا مقالہ "عظیم ندوی، فلسفی وصوفی" بنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ میں مذکورہ مقالے سے بہت متاثر ہوا ہوں، اور اس کی تحسین ہی کے لیے اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بے ربط خیالات اور احساسات وتاثرات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی انسان کا مرکز ومحور ہے، اور باطنی رموز

---

[1] الحمد للہ! [2] آمین! [3] جواب دیا جا چکا، خدا کرے پہونچ جائے۔

واسرار ہر شخص پر اس کے اپنے وسعت ظرف کے مطابق کھلتے چلے جاتے ہیں، اور محسوس ہوتا ہے کہ ایک مقام منازل سلوک میں ایسا بھی آتا ہے کہ انسان کے قلب و روح، طمانیت وسکون کا گنجینہ بن جاتے ہیں، اسی کا ذکر سورۂ یونس میں ہے، اس مقام پر آکر انسان دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔

محترم مقالہ نگار نے "ربوبیت کا فیضان" کا عنوان قائم کر کے اس لطیف و عمیق بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سالک کیلئے اس سے زیادہ آسان راستہ نہ تجربہ میں آیا اور نہ سمجھ میں کہ دنیا و دین کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں ربوبیت کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرتا رہے، بارگاہِ رب العزت میں التماس ہے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

ویسے تو ہر شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا عقیدہ متزلزل کیوں ہونے لگتا ہے، معلوم و محسوس ہوتا ہے کہ معاملہ زبانی اقرار سے بہت آگے کا ہے کہ انسان کے قلب و روح میں "ربوبیت" اس طرح راسخ ہو جائے کہ زندگی کے نشیب و فراز میں متزلزل ہونے کے بجائے مزید سکینت کا باعث ہو جائے، لیکن یہ مقام عارف رومیؒ کی نظر میں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک، عارف باللہ کی صحبت میسر نہ آ جائے، قرآن و حدیث میں اس کی بڑی واضح شہادتیں موجود ہیں، بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ وہ کریم و رحیم رب ذوالجلال ہمیں برگزیدہ بزرگان دین کی صحبتیں نصیب فرمائے، آمین ثم آمین۔

تجدید معاشیات کے عنوان سے بڑی اعلیٰ گفتگو کی گئی ہے، کہ اسلامی معاشیات کا سارا زور انفاق پر ہے، اور جدید معاشیات کا سارا زور کسب پر ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید معاشیات نے آج کی انسانی برادری کو بندۂ شکم و لذت بنا دیا ہے، انسانی برادری کے

تعلقات میں نہ خلوص ہے نہ محبت و پیار، بلکہ نفرت و عداوت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان انتہائی درجہ کا خودغرض ہو گیا ہے، اور خودغرضی میں محبت و پیار بھی کسی نہ کسی لالچ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور یہ سب دین ہے جدید معاشیات کی، حقیقت یہ ہے کہ چند الفاظ میں مولانا عبدالباری ندویؒ نے آج کی دنیا کے مسائل کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

تجدید تعلیم و تبلیغ کے عنوان سے جو بحث کی گئی ہے وہ بھی قابل غور ہے کہ جس نظام نے خدا اور آخرت کی مطلوبیت و مقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کر کے صرف جاہ و مال، حکومت و تجارت اور نفسانی و حیوانی لذت و راحت کو انسان کا مطمح نظر قرار دیا ہو اس سے کبھی بھی بہترین نتائج نہیں نکل سکتے، حقیقت میں تعلیمات و معاشیات کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور جدید معاشیات موجودہ نظام تعلیمات ہی کی پیداوار ہے، جس کی وجہ سے یہ ناسوتی کائنات جہنم خانہ بن کر رہ گئی ہے، باوجودیکہ تعلیم عام نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت یہ اپنے حقیقی مقاصد سے بہت دور ہے۔

قرآنی خدمات کے عنوان سے بھی بڑی گہری گفتگو کی ہے کہ اس محدود کائنات ہی کے سربستہ راز آج تک انسان پوری طرح نہیں کھول سکا تو "معنوی کائنات" کی تو بات ہی کیا ہے، کون ہے جو اس کی گہرائیوں تک پہونچ سکے، سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنے اپنے ظرف و استعداد کے مطابق عطا فرما دیتا ہے "جام دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

دیگر مباحث بھی مذکورہ مقالے میں بڑی وسعت و گیرائی کے حامل ہیں، لیکن میں تو اس کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں کہ شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈال سکوں، صرف اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بات حقیقت پر مبنی ہے، اور میری اس حاضری کا مقصد بھی یہ ہے کہ بقول مولانا غلام محمد صاحب کے جناب مولانا عبدالباری ندوی کی تصانیف کو معارف میں جگہ دی جائے تاکہ یہ فیضان عام ہو سکے[1]۔

---

[1] مولانا کی اکثر تصانیف شائع ہو چکی ہیں، قرآنی کلامیات پر ان کی تصنیف کا مسودہ مل جائے تو دارالمصنفین اس کی اشاعت پر ضرور توجہ دیگا (معارف)

اس مضمون سے یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مقام کیا تھا کہ جناب سید سلیمان ندویؒ، عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ جیسے نابغۂ عصران کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

میری پھر ایک دفعہ التماس ہے کہ معارف میں "طب نبوی اور جدید سائنس" کے موضوع پر اور قدیم طب پر مضمون شامل ہونے چاہئیں[1]۔ میں نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہمارے دینی ماہناموں میں اس موضوع کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے، حالانکہ اس جدید دور میں اس کی بہت ضرورت ہے، وجہ یہ ہے کہ بے چارے غریب لوگ ڈاکٹروں کے ہاتھوں بری طرح لٹ رہے ہیں، اس لیے اس موضوع پر لکھنا بہت بڑی نیکی بھی ہے اور مفید علمی و دینی خدمت بھی، لیکن لکھنے کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ علم جدید کے تقابل کے ساتھ اسے پیش کیا جائے، میں خیال کرتا ہوں کہ اگر صرف طبِ نبویؐ ہی کو موضوع بنایا جائے تو یہ بھی بڑا وسیع موضوع ہوگا۔

ہمارے ملک[2] میں ایک ڈاکٹر صاحب نے "طب نبویؐ" اور جدید سائنس کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، اور اس کی دوسری جلد ابھی غالباً زیر تصنیف[3] ہے۔

یہاں ہندوستان میں اس موضوع پر کوئی ماہنامہ نکلتا ہو تو مجھے ضرور مطلع فرمائیے مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا، میری طرف سے رفقائے دارالمصنفین کو بہت بہت دعائیں اور سلام کہیں، خدا کرے یہ ادارہ مستقبل میں اسی طرح سے پھلتا پھولتا رہے، اور اللہ تعالیٰ اس باغ کے ہر نئے باغبان کو مخلصانہ آبیاری کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حامی و ناصر ہوں۔

مخلص : گلزار احمد

---

[1] معارف میں اس موضوع پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، اب بھی اس کے لیے اس کے صفحات حاضر ہیں (معارف) [2] یعنی پاکستان میں [3] یہ کتاب یہاں تک نہیں پہونچی۔

بَابُ التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

سہ ماہی فکر و نظر (سید صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر) ایڈیٹر ڈاکٹر ظفر محمد زماں، جنوری و مارچ ۱۹۸۸ء قیمت ۱۰ روپیے، کاغذ و طباعت عمدہ، پتہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد پاکستان،

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین، اپنے علمی و تحقیقی کارناموں کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں معروف اور ممتاز تھے وہ پاکستان جاتے تو دارالمصنفین سے ان کے ذمہ دارانہ تعلق اور خود ان کی گوناگوں ذاتی خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے ان کا وہاں بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا، ان کو استقبالیے دیے جاتے اور پُر لطف علمی و ادبی مجلسیں ہوتیں، ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد ہندوستان کی طرح پاکستانی جرائد و مجلات نے بھی مضامین شائع کیے، اب ادارہ تحقیقات اسلامی جیسے مؤقر ادارہ کی طرف سے اس کے سہ ماہی ترجمان فکر و نظر کا یہ خاص شمارہ انہی کی یاد میں شائع کیا گیا ہے، اس کے آغاز میں دارالمصنفین کا تعارف ہے جس میں اس کے قیام کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے اور سیرت نبوی، سیرت صحابہ و تابعین، سوانح، ادبیات، تاریخ اسلام، تاریخ علوم و فنون، تاریخ ہند اور فلسفہ و سماجی علوم پر دارالمصنفین کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد دارالمصنفین کے اس عظیم و نامور مصنف اور علامہ شبلیؒ و مولانا سید سلیمانؒ کے جانشین یعنی سید

صباح الدین عبدالرحمٰن کی علمی وتحقیقی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے" مختلف مقالات درج ہیں، جو کئی حصوں پر مشتمل ہیں، حصۂ اول میں ڈاکٹر معزالدین، شاہ محی الحق فاروقی، مولانا کوثر نیازی اور ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے تاثراتی مضامین ہیں جن سے مرحوم کے علمی وادبی حلقوں روابط و تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے محاسن اخلاق اور علمی کمالات بھی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ حصہ دوم میں سید صباح الدین مرحوم کی اہم تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے سید ظفر احمد نے اہم تصنیفات کی ایک مختصر فہرست دی ہے، پھر پاکستان کے معزز اہل قلم اور معروف طبیب جناب حکیم محمد سعید صاحب نے مرحوم کی تصنیفات کا جائزہ لینے کے علاوہ ان کی مقالہ نگاری پر بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر خورشید رضوی (غالب مدح وقدح کی روشنی میں) محمد میاں صدیقی (بزم صوفیہ) ڈاکٹر محمد طفیل (سلاطین علما و مشائخ کے تعلقات) ڈاکٹر محمد ریاض (سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ادب شناسی) کے مضامین بھی اہم ہیں، مگر یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اس نمبر میں ڈاکٹر یوسف عباس ہاشمی نے سیرۃ النبی جلد ہفتم کا بھی جائزہ لیا ہے جو در اصل حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف ہے، مگر انھوں نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ اس جلد کے حوالوں، حواشی اور ترتیب وغیرہ کا کام جناب سید صباح الدین مرحوم نے انجام دیا ہے (ص ۱۳۳) پھر انھوں نے یہ بھی سوچا کہ غالباً از راہ تواضع، سید صباح الدین مرحوم نے اس جلد پر مؤلف کی حیثیت سے اپنا نام نہیں دیا" حالانکہ اس جلد کے مقدمہ ہی سے اس قیاس کی تردید ہوجاتی ہے۔ اس جلد کے متفرق مضامین مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی ہی میں معارف میں شایع ہوچکے تھے، سید صباح الدین مرحوم نے ان کو نیز اس جلد کے مزید مسودوں کو سید صاحبؒ کے عزیزوں سے حاصل کرکے کتابی صورت میں شایع کردیا ہے۔ اس جلد کے تجزیاتی مطالعہ میں بھی یوسف ہاشمی صاحب نے محض اپنے

قیاس سے بعض بے بنیاد باتیں لکھی ہیں، فکر و نظر کے اس خاص شمارہ کے مقالات کا حصہ سوم سید صباح الدین مرحوم کے مضامین پر مشتمل ہے، اس میں ان کے دو مضامین "اسلامی ریاست کا تصور" اور "موجودہ ہندوستان میں اقبال" شامل ہیں، ان کے علاوہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود اور منٹگمری واٹ کی کتاب محمد ایٹ مکہ پر ان کے طویل سیر حاصل تبصرے بھی ان کی تبصرہ نگاری کے نمونہ کے طور پر اس مجموعہ میں شامل کردیے گئے ہیں۔ آخر میں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے ایک انٹرویو (از ممتاز لیاقت) اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن پاکستان میں (از ڈاکٹر محمد یونس) بھی دئے گئے ہیں جن سے مرحوم کی سوانح کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں،

ادارہ تحقیقات اسلامی اپنے خوبصورت ٹائپ کی طباعت اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے پاک وہند میں معروف ہے، یہ خاص نمبر گو سید صباح الدین مرحوم کی مکمل سوانح کا بدل نہیں ہے تاہم اس سے ان کی شخصیت اور کارناموں کا اچھا تعارف ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ شمارہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور ادارہ تحقیقات اسلامی اس نمبر کی اشاعت پر علمی وادبی حلقوں کی طرف سے تحسین وقدردانی کا مستحق ہے۔

ماہنامہ ذکر و فکر (خاص شمارہ: بیادگار مولانا رحمت اللہ کیرانوی) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی صفحات ۱۲۶-کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت ۱۰ روپیہ پتہ: جی ۱-۲۷۱ اوکھلا جامعہ نگر نئی دہلی،

مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۳۳-۱۳۰۸ھ) گذشتہ صدی کے ہندوستان کے ایک نامور عالم دین کامیاب مناظر اسلام اور ممتاز محقق و مصنف تھے، رد عیسائیت میں ان کی تحقیقات اور پادری فنڈر سے ان کے کامیاب مناظرے وغیرہ ان کے لازوال کارنامے ہیں۔

ان کی تصنیف اظہار الحق اس موضوع پر قول فیصل ہے جس کا اردو ترجمہ بھی بائبل سے قرآن تک کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کا قیام بھی مولانا کا بڑا کارنامہ ہے، اس کی بدولت سرزمین حجاز میں علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ ابھی تک مولانا کیرانوی کی کوئی مبسوط سوانح عمری نہیں لکھی گئی ہے، اس لحاظ سے ماہنامہ ذکر و فکر کا یہ خاص نمبر قابل قدر ہے، اس میں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی اور خواجہ احمد فاروقی کے اداریوں سے مولانا کے عہد و ماحول کا حال معلوم ہوتا ہے، اس کے پس منظر میں ان کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے پھر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقالہ "اظہار الحق اور اس کے مؤلف حضرت مولانا کیرانوی" ہے، اس نمبر کا سب سے اہم اور مفصل مضمون مولانا کیرانوی کے جانشین مولانا محمد سلیم کیرانوی مرحوم کا ہے جو بڑے منتظم، خوش گفتار اور ہردل عزیز عالم اور مدرسہ صولتیہ کے دور ثانی کے معمار تھے، مولانا محمد سلیم کے صاحبزادہ اور مدرسہ صولتیہ کے موجودہ ناظم مولانا محمد شمیم کا مقالہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ دوسرے مقالہ نگار یہ ہیں حکیم عبدالقوی دریابادی (مولانا کیرانوی اپنی تصنیف اعجاز عیسوی کے آئینہ میں) سید غلام محی الدین (پادری سی جی فنڈر) مولانا نذر الحفیظ (تلخیص: ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کی سازش اور مولانا کیرانوی کا بروقت انتباہ) مولانا شفیق الرحمن ندوی (مولانا کیرانوی۔ ایک کامیاب مناظر) محمد ثناء اللہ (مولانا کیرانوی کا زمانہ اور اس دور میں عیسائیت کی تبلیغ میں انگریزوں کی سرگرمیاں) ان سب مضامین سے سرزمین حرم میں مدفون ایک ایسے ہندی نژاد مجاہد عالم کے تعارف کا حق ادا ہو گیا ہے جس کی صدائے رعد آسا نے انگریزی سامراج کو لرزہ براندام کر دیا تھا اور جس کے تصنیفی اور تعلیمی مساعی سے پورے عالم اسلام کو فیض پہنچا ہے۔

بلے بلے سہ ماہی (جگن ناتھ آزاد نمبر) مرتبہ: حبیب سوز اور خاں فہیم صاحبان، شمارہ

جولائی ۱۹۸۶ء تا فروری ۱۹۸۸ء، صفحات ۶۰۰، قیمت ۲۰ روپیہ پتہ: دفتر بلے بلے، امام باڑہ اعلیٰ پور بدایوں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے شاعرانہ کمالات اور تصنیفی کارناموں سے اب برصغیر کے باہر دوسرے ممالک بھی متعارف ہو چکے ہیں، ان کے کلام کے چھوٹے بڑے درجنوں مجموعے بھی چھپے ہیں اور اسی قدر ان کی نثری تصانیف بھی شایع ہوئی ہیں، اس لیے وہ اردو کے نامور شاعر، اچھے ادیب و نقاد اور مشہور مصنف و محقق کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر چکے ہیں، اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ان کی متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں اور اقبالیات کے تو وہ مستند شارح و ماہر ہی ہیں۔ تقسیم ہند کے دلدوز واقعات پر ان کی درد و اثر میں ڈوبی ہوئی نظمیں بڑی مقبول ہوئیں، ۱۹۵۱ء میں ان کی نظم "بھارت کے مسلمان" سے مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہوا اور ان کی شرافت کے جوہر بھی کھلے، اس وقت اقبالیات کی طرف ان کی توجہ بھی بظاہر خلاف مصلحت تھی مگر ان کی جرأت گفتار نے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری کو نئے انداز سے پیش کر کے مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب کی گرد بڑی خوبی سے صاف کی ہے، وہ خود پاکستان میں پیدا ہوئے اور وہاں سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں بود و باش اختیار کی مگر اس سے ان کے اندر ردعمل کے طور پر منفی جذبات و احساسات پیدا نہیں ہوئے، بلکہ ان کی فکر بلند اور طبعی شرافت نے ان کو محبت کا پیامبر اور انسانیت کا علمبردار بنائے رکھا، ان کے ان علمی و ادبی کمالات اوصاف و امتیازات کا مشرق و مغرب میں اعتراف کیا گیا ہے اور ان پر اب تک کئی مستقل کتابیں اور رسائل و مجلات کے خاص نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ سہ ماہی بلے بلے بدایوں کا خاص شمارہ بھی ہے، اس کے شروع میں آزاد صاحب کے حالات و واقعات زندگی کی اہم تاریخیں درج

ہیں۔ اس سے ان کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف نظم و نثر اور طویل نظموں اور انگریزی تصانیف کے بارہ میں بھی واقفیت ہوتی ہے۔ اس میں ان کے توسیعی خطبات اور ہند و بیرون ہند کے مختلف سیمناروں میں ان کے مقالات کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔ وہ جن علمی و ادبی انجمنوں اور اداروں کے رکن ہیں، بیرون ملک میں ان کے جو پروگرام براڈکاسٹ یا ٹیلی کاسٹ ہوئے اور ان کو جو اعزازات و انعامات حاصل ہوئے ان کی بھی پوری تفصیل درج کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد مضامین ہیں جن کو اس خاص نمبر میں شخص اور عکس، شعریات، نثریات، اقبالیات، اقبال نمائش، ملاقاتیں، منظومات، اپنی محفل اپنے دوست (خطوط بنام آزاد) اور انتظاریہ کے عنوانات سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اقبال نمائش (سرینگر) کی دلچسپ تقریبات کی روداد خود جگن ناتھ آزاد کے قلم سے ہے۔ اس ایک تفصیلی روداد کے علاوہ بقیہ تمام مضامین دوسروں کے ہیں جن میں قدیم و جدید تحریریں یکجا ہیں اور ان سے تحقیق و ادب اور نقد و صحافت کے مختلف حلقوں کی نمائندگی ہو گئی ہے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی، سید صباح الدین عبدالرحمن، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر گیان چند، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر راشد کاکوئی، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، انتظار حسین، عطاء الحق قاسمی، حکیم محمد سعید، حمیدہ سلطان احمد، رام لعل، پروفیسر صدیق جاوید، راج کمار چندن، یوسف ناظم، اشرف قادری، رام پرکاش راہی، محمد ایوب واقف، فرید احمد برکاتی اور ڈاکٹر منظر اعظمی وغیرہ کے مضامین اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔ جناب آزاد کو رباعیات، قطعات، غزل اور نظم کے ذریعہ جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ان کے بارہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے وہ "منظومات" کے زیر عنوان درج ہیں۔ یہ بزم بھی ان کے والد گرامی تلوک چند محروم کے علاوہ جوش ملیح آبادی، نشور واحدی، گوپی ناتھ سنگھ گوہر اور کئی دوسرے نامور شعراء کے کلام سے آراستہ کی گئی ہے۔ اس خاص نمبر میں جناب

آزاد سے کئی ملاقاتیں (انٹرویو) بھی شامل ہیں جن سے ان کے حالات اور خیالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی مشہور نظم "بھارت کے مسلمان" تقسیم ہند کے چند سال بعد، الجمعیۃ سے نقل کر کے معارف میں شایع کی گئی تو پاکستان سے اسد ملتانی نے اور اعظم گڈھ سے یحییٰ اعظمی نے اس کے اعتراف میں نظمیں لکھیں، اس نظم میں جناب آزاد کے متوازن نقطہ نظر اور پھر جرأت و شرافت کو حیرت و مسرت کے ساتھ سراہا گیا۔ ان کی یہ نظم مسلمانوں کے لیے بھی حوصلہ افزا ثابت ہوئی، ادب اور شرافت کی یہ شیریں اور خوش گوار داستان بھی اس شمارۂ خاص میں تفصیل کے ساتھ محفوظ کر دی گئی ہے۔ جس کا عنوان یہ ہے "بھارت کے مسلمان، ایک نظم، ایک کہانی"۔

یہ خاص نمبر معمولی کاغذ پر لیکن بڑے سلیقہ سے شایع کیا گیا ہے۔ اس میں کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں اور اس خاص شمارہ کی قیمت بھی اگرچہ زیادہ ہے تاہم وہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بارہ میں ایک قیمتی دستاویز ہے جس کی علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی جانی چاہیے۔

ہفت روزہ الاعتصام (اشاعت خاص بیاد: مولانا محمد حنیف ندوی) دسمبر ۱۹۸۸ء مدیر علیم ناصری صفحات ۲۳۰ قیمت ۲۵ روپیے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، ناشر حافظ احمد شاکر، شیش محل روڈ لاہور،

جماعت اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام لاہور کے پہلے مدیر (۴۹ تا ۶۵ء) مولانا محمد حنیف ندوی (۱۹۰۸ - ۱۹۸۷ء) برصغیر خصوصاً پاکستان کے معروف صحافی، ممتاز خطیب اور مشہور مصنف و مفسر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے لاہور کو اپنی صحافت، خطابت اور تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہ عرصۂ دراز تک

پاکستان نظریاتی کونسل کے ممبر رہے، ادارہ ثقافت اسلامیہ سے بھی وابستہ ہوئے، بے شمار مضامین کے علاوہ تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کیں، فلسفیانہ انداز کے باوجود ان کی تحریریں شستہ، سلیس اور مدلل ہوتی ہیں، اس بنا پر ان کی اکثر تصانیف مقبول ہوئیں، مگر ان کی کتاب مسئلہ اجتہاد کے چند مباحث سے عام طور پر اختلاف کیا گیا ہے۔ مولانا کے اعتدال و توازن اور مخصوص علمی اور فلسفیانہ رنگ کی وجہ سے ان کی شخصیت دل آویز تھی، ہفت روزہ الاعتصام نے ان کی شخصیت اور متنوع خدمات کا تعارف کرانے کی غرض سے اپنا یہ خاص نمبر شایع کیا ہے، اس میں مولانا ندوی کی جماعتی خدمات، ان کے علمی و تصنیفی کاموں اور ان کے حالات و سوانح پر مختلف مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے، اہل صحافت کا خراج تحسین، دینی جرائد کے اداریے اور تعزیتی خطوط کے علاوہ، مولانا کے انتقال پر کہی جانے والی نظموں کا ایک اچھا انتخاب اور ان کے علمی افادات کے چند نمونے بھی اس نمبر میں شامل کر دیے ہیں۔ نیز مولانا ندوی کے مضامین و مقالات کا تفصیلی اشاریہ (انڈیکس) بھی دیا گیا ہے جس سے اس خاص شمارہ کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

ع۔ک (باقی)

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ شورش از غلام حسین شورش مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، تقطیع متوسط، کاغذ،

(رموز الشعرا) کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۵، مجلد، قیمت ۳۴ روپیے، پتہ اترپردیش اردو اکاڈمی، قیصر باغ، لکھنؤ،

میر غلام حسین شورش عظیم آبادی بارہویں صدی ہجری کے ذی کمال اور صاحب تصانیف شخص تھے، گو تذکرہ نگاروں نے صرف شاعری کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے مگر ان کی نثری تصانیف میں اردو شعرا کا یہ تذکرہ بعض حیثیتوں سے اہم ہے، اس کا ایک مخطوطہ باڈلین آکسفورڈ میں محفوظ تھا جس کو کلیم الدین احمد صاحب نے "دو تذکرے" میں شامل کیا ہے، چند برس قبل ڈاکٹر محمود الٰہی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی و چیرمین اترپردیش اردو اکاڈمی کو بھی اپنے تحقیقی کاموں کے دوران میں خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتبخانے میں اسکا ایک نسخہ دستیاب ہوا دونوں کا مقابلہ کرنے پر انھیں معلوم ہوا کہ نسخہ آکسفورڈ میں کافی مسخ و تصرف ہوا ہے اس لیے انھوں نے خانقاہ رشیدیہ کے نسخہ کو اپنے محققانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے، شورش کے تذکرہ میں شعرا کے احوال اور انتخاب کلام کے علاوہ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں شعر و شاعری کے متعلق مفید باتیں تحریر کی گئی ہیں، عام شاعروں کے حالات انھوں نے میر کے نکات الشعرا اور سید علی فتح گردیزی کے تذکرۂ ریختہ گویاں سے لیے ہیں لیکن عظیم آبادی شعرا کے حالات خود انکی تحقیق و دریافت کا نتیجہ ہیں دوسرے تذکروں کے مقابلہ میں تذکرۂ شورش میں اشعار کا انتخاب زیادہ ہے، فاضل مرتب کے مقدمہ میں تذکرۂ شورش کی اہمیت اور قدر و قیمت مختلف حیثیتوں سے دکھائی گئی ہے انکے خیال میں بہار میں اردو شاعری

ع۔ گوئیا۔
ز۔ بھرائی۔

کے آغاز اور ابتدائی نشو ونما کے بارے میں مستند معلومات اور نئے مواد فراہم کیے جانے کی وجہ سے یہ اردو شعراء کے ان تذکروں سے اہم ہے جو بہار میں لکھے گئے، ان کے نزدیک تذکرہ شورش سے بعض مسلمات کی تردید، غلط فہمیوں کا ازالہ اور بعض قیاسات کی توثیق ہوتی ہے اس سلسلہ میں نسخہ آکسفورڈ کے مسخ و تصرف اور تذکرۂ شورش کے زمانۂ تصنیف کی تعیین کی گئی ہے اور اس کے محتویات، انداز بیان اور بعض بیانات سے دریافت ہونے والی نئی باتوں کی نشاندہی کی ہے نیز اس کی تصنیف کی غرض و وجہ، شورش کے حالات اور تذکرہ نگاری میں ان کے امتیازات وغیرہ پر داخلی شواہد کی مدد سے بحث کی ہے۔ آخر میں مقدمہ شورش اور زیر نظر خطی نسخہ کے متعلق ضروری باتیں لکھی ہیں، ان کے مقدمہ سے تذکرہ کی اہمیت اور فائدہ دوچند ہو گیا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰، قیمت ۱۰ روپیے، پتے (۱) جامعۃ الزہرا، جاجمؤ، کانپور (۲) نیو لائٹ ٹینری جاجمؤ، کانپور،

زکوٰۃ اسلام کا اہم رکن اور عظیم الشان عبادت ہے، یہ رسالہ اسی سے متعلق ہے جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی مشہور اور اپنے موضوع پر بے مثال کتاب "ارکان اربعہ" سے ماخوذ ہے اسمیں مال کے بارے میں اسلامی تصور، انفاق کی تاکید اور اسکے بارے میں خیر القرون کے مسلمانوں کا طرز عمل بیان کیا گیا ہے اور زکوٰۃ اور اسکے سلسلہ کے تمام احکام و شرائط کی غرض و حکمت اور مصلحت و موزونیت دکھائی گئی ہے ٹیکس اور سود سے زکوٰۃ کا فرق واضح کر کے اسکے گوناگوں امتیازی پہلو نمایاں کیے ہیں اور دوسرے مذاہب میں رائج زکوٰۃ و خیرات کے طریقوں کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نے ان میں کیا اصلاح کی ہے، آخر میں اسکی مذہبی اہمیت بیان کی ہے، اس زمانہ میں مسلمان اس فریضہ سے غافل اور اسکے خیر و برکت سے محروم ہیں اسلیے الحاج مولوی عین الحق اعظمی نے اپنے دینی جذبہ کی بنا پر یہ رسالہ علیحدہ سے شایع کیا ہے۔ "ض"